مضامین

تنقیدی زاویے

ڈاکٹر سلیم زبیری

تنقیدی زاویے

(تنقیدی مضامین)

ڈاکٹر سلیم زبیری

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

CRITICAL AND LITERARY ARTICALES
Written by
DR.SALEEM ZUBERI

Year of 1st Edition 2010
ISBN 978-81-8223-803-9
Price Rs. 150/-

نام کتاب تنقیدی زاویے
مصنف ڈاکٹر سلیم زبیری
سنِ اشاعت اوّل ۲۰۱۰ء
قیمت ۱۵۰روپے
ٹائپ اینڈ ڈیزائن براڑ آرٹس
Ph:01675-264467
مطبع عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

ناشر

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 091-011-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

BRAR SONS
B-14/594,Hazrat Sheikh Road,
Maler,Malerkotla-148023(Pb)
Ph:01675-264467,Mob:09256552447,

انتساب۔۔۔

فروغِ اُردو کے لیے

کام کرنے والے

شیدائیوں

کے نام

☆☆☆

اپنی بات

میں شروع ہی سے ادب برائے زندگی اور ادب برائے اصلاح کا قائل رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی موضوع پر قلم اُٹھاتے وقت میں نے ہمیشہ تنقید برائے ادب اور تنقید برائے اصلاح کو ہی ملحوظ رکھا ہے۔ انجام چاہے کچھ بھی ہو۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ مجھے اپنے گھر سے جو اُردو کی تہذیب اور تربیت ملی ہے۔ اس نے مجھے ہمیشہ سچ بولنے، سچ لکھنے اور سچ کی حمایت کرنے پر اُکسایا ہے۔ ادبی حلقوں میں میری تخلیقات کی پذیرائی ہو یا نہ ہو میری تحریر کسی کو ہضم آئے یا نہ آئے۔ ادبی دوستوں کے ناراض ہونے اور اپنوں سے مراسم خراب ہونے کے اندیشے نے کبھی میرے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دی۔

ہوائیں کتنی ہی تیز و تند کیوں نہ ہوں، چراغ کبھی اندھیروں کی وکالت نہیں کرتا، سچ پر کتنے ہی پہرے کیوں نہ بٹھا دیئے جائیں۔ ایک نہ ایک دِن وہ سب پر آشکار ضرور ہوتا ہے۔ سچ سے روگردانی دراصل اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ کوئی بھی شاعر و ادیب تب تک عظیم نہیں ہوسکتا، جب تک وہ سچائیوں کا نقیب اور پرستار نہ ہو۔ تخلیق کار میں جس قدر اخلاص اور سچائی ہوگی اُسی قدر دور تک اُس کے فن کی خوشبو پھیلے گی۔ علاقائی قدریں اپنی جگہ، آفاقی قدروں کا حامل فن ہی پائیدار ہوتا ہے اور حیاتِ جاودانی حاصل کرتا ہے۔

میری نظر میں تنقید، توصیف اور تنقیص کی دودھاری تلوار ہے۔ جسے چلانے کے لئے بڑی مشاقی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر کسی میں اِسے چلانے کا سلیقہ نہ ہو تو یہ بڑے بڑوں کے سر قلم کردیتی ہے۔ جانبداری سے کیا گیا تنقید کا ایک وار ہی کسی کو عرش سے فرش پر

اور کسی کو فرش سے عرش پر بیٹھا دیتا ہے۔ نتیجتاً ہر ایرا غیرا ادب کی پہلی صف میں آ کر کھڑا ہو جا تا ہے۔ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، منٹو اور بیدیؔ غرض کوئی بھی ادیب و شاعر تنقید سے ماورا نہیں ہے۔ تنقید نے کبھی ذوقؔ کو غالبؔ سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی نا کام کوشش کی اور کبھی فیضؔ کو مجازؔ سے کمتر گردانے کی سعئی لا حاصل کی۔ لیکن وقت سب سے بڑا نقاد ہے اور اس کے فیصلے بالکل اٹل۔

الحمد اللہ راقم کو اپنے تیئں نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے اور نہ ہی کسی قسم کا تنقیدی خبط۔ البتہ تنقیدی نکتہ ءنگاہ سے چند مضامین لکھے ہیں۔ جو ''تنقیدی زاویے'' کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ اِن مضامین میں بعض فرمائشی ہیں اور بعض میرے ذاتی شوق کا حاصل ہیں۔ خاکسار نے تنقیص اور بے جا توصیف سے گریز کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی ہے۔ مضامین لکھتے وقت ہر لحظ اپنی علمی کم مائگی کا احساس دامن گیر رہا۔ ادب کا یہ ادنیٰ سا طالب علم اپنی اس کاوش میں کہاں تک کامیاب رہا اس سلسلے میں آپ کی آراء اور مفید مشورے میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

آپ کی آراء کا منتظر

ڈاکٹر سلیم زبیری

مضامین

اقبال کا تصوّرِ وطن

لفظ ''وطن'' میں جس قدر شیرینی و دلکشی کے اعتبار سے گہرائی ہے اس کا مفہوم بھی اسی قدر وسیع ہے۔ پرندے کے لیے اُس کا آشیانہ ہی وطن ہے۔ بچہ اپنے گھر ہی کو اپنا وطن سمجھتا ہے۔ انسان جہاں طفولیت کے ایام بسر کرتا ہے ان مقامات کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ایک انگریز شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

''بچپن میں میرے چھوٹے چھوٹے پاؤں جن جن پہاڑوں سے گزرے ہیں میں ان پہاڑوں کو نہیں بھولا ہوں۔''

ایک عمر رسیدہ انسان بھی اپنی جائے پیدائش کو دل سے محو نہیں کرسکتا۔ شاعرِ مشرق بھی اس معاملہ میں بڑے حساس تھے۔ جس طرح ان کی شاعری منفرد اور یگانہء روزگار ہے۔ اسی طرح ان کا وطنیت کا تصور بھی انوکھا اور نرالہ ہے۔ حکیم الامت نے وطنیت کے محدود تصور کے بجائے بڑا جامع اور وسیع تصور پیش کیا ہے۔ جو ہر لحاظ سے صحت مند اور مثبت ہے۔

بہت سے ناقدین ادب نے جو غالباً پیامبر شاعر کے کلام کی روح سے ناواقف ہیں ان کی حب الوطنی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے جو کسی طرح بھی روا نہیں ۔علامہ اقبال جیسا آفاقی شاعر اپنے لئے فرسودہ اور تنگ حب الوطنی کے تصّور کو کیا تسلیم کرسکتا تھا۔ وطن عبارت ہے اہلِ وطن سے مختلف اقوام اور مختلف نسلوں کے لوگوں ہی سے وطن کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے۔ برادرانِ وطن سے اخوت و محبت اور الفت ہی حب الوطنی کا تقاضا ہے۔ یہی تھا شاعرِ مشرق کا پیغام اور یہی تھی اُن کی حب الوطنی کی اساس۔

گنگا جمنی تہذیب کی آبیاری اور تمام مذاہب کے رہنماؤں اور پیشواؤں کا احترام محبِ وطن کی شاعری کا محور ہے۔ اقبالؔ ان شاعروں میں سے تھے جن کے لیے وطن کی محبت ایمان ہی کا ایک حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے وطن بلکہ اہلِ وطن کے سچے خیر خواہ، ہمدرد ،مونس اور غمخوار تھے۔ لیکن اُردو شاعری کا یہ درخشندہ ستارہ وطن کو ایک بت تصور نہیں کرتا تھا۔ پرستش وہ اپنے خداوند ہی کی کرتا تھا اور اپنے خدا کے حکم کی تکمیل کرتا ہے۔ ساکنان وطن بلکہ بنی نوع انسان کے ساتھ سچی محبت بھی احکام خداوندی کی تعمیل ہے اور اسی تصور وطن سے اس کی شاعری کا خمیر تیار ہوتا ہے۔

اقبال نے نہ صرف اپنے وطنِ عزیز سے ٹوٹ کر محبت کی بلکہ اپنی قوم اور تمام ساکنان وطن کے بھی جذبہ ،حب الوطنی کو بیدار کیا اور اسی جذبہ سے سرشار ہو کر اپنی ولولہ انگیز نظموں کے ذریعے اہلِ وطن کے دلوں کو گرمایا۔

ناقدینِ اقبال نے اقبالؔ کی شاعری کو بنیادی طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا ہے اور پہلے دور کی شاعری کو قومی شاعری سے منسوب کیا۔ اقبال کی شاعری کا پہلا دور وہ دور ہے جس میں اقبال کی تمام تر شاعری پر حب الوطنی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اس دور کی مشہور نظموں میں سے نظم ''ہمالہ'' حب الوطنی کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

''ترانہ ،ہندی'' بھی اقبال کی اُن شاہکار نظموں میں سے ہے جس میں اقبال نے ہندوستان کی شان وشوکت اور یہاں کی تہذیب وتمدن کے گیت گائے۔ یہ نظم نہ صرف

وطن پرستی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے بلکہ اس میں اقبال کا جذبہ حب الوطنی بامِ عروج پر نظر آتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم ، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی ، دل ہو جہاں ہمارا

سیّد مظفر حسین برنی اپنی کتاب ''اقبال اور قومی یکجہتی'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعے قومی اتحاد اور یکجہتی کے پیغام کو عام کیا وہ قومی اتحاد اور یکجہتی کے نہ صرف حامی تھے بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب بنیادی طور پر ایک اتحاد پیدا کرنے والی قوت ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

حب الوطنی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ایک دوسری نظم جس کا عنوان ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' ہے۔ میں اقبال نے مختلف مذاہب کی موجودگی میں بھی ملک کی وحدت ،اتحاد اور یکجہتی کا گیت گایا ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

برنی صاحب ''محبِ وطن اقبالؔ'' میں لکھتے ہیں کہ ''بچوں کی دُعا' نظم میں اقبالؔ نے اپنے تزئینِ وطن کے جذبہ کا اظہار اِس شدّت سے کیا ہے کہ ہمیں اپنے ملک میں ایسی پھبن سے رہنا چاہئے جس طرح چمن میں پھول رہتا ہے۔

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

نظم ''نیا شوالہ'' میں اقبالؔ نے جہاں واعظ و برہمن پر طنز کے تیکھے وار کئے ہیں وہیں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو مل جل کر رہنے اور امن و آشتی کا پیغام بھی دیا ہے۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا تو خدا ہے
خاکِ وطن کو مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور جو کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ان کا یورپ میں قیام کا زمانہ ہے اقبال کی شاعری میں ایک اہم موڑ کا درجہ رکھتا ہے یہی وہ دور ہے جس میں اقبال کے افکار وخیالات اور نظریات میں غیر معمولی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ یورپ میں قیام کے دوران اقبال نے مشاہدہ کیا کہ وطن پرستی کا بت بڑا ہلاکت خیز ہے اور کس طرح وطن پرستی کے نشے میں چور خود مختار اور طاقت ور قومیں اقتدار کے لالچ میں کمزور قوموں پر قبضہ کر کے انہیں اپنا محکوم بنالیتی ہیں۔ اپنے اسی گہرے مشاہدے کی بنا پر انہوں نے قوم پرستی کے محدود نظریہ کو یکسر ترک کر دیا۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بقول مظفر حسین برنی:

اپنے محدود نظریہ قومیت کو ترک کرنے کے بعد اقبال ایک ایسے بین الاقوامی نظام کے متلاشی ہوئے جو بلند افکار اور اخلاقی اقدار پر مبنی ہو۔ انہوں نے سوچا کہ اس نئے سماجی نظام کے لئے اسلام ہی ایک خاکہ پیش کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کے حالات کے پیش نظر ساری انسانیت کو اسلام کے نام پر متحد کرنے کی اقبال کی خواہش شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکی۔ دراصل اقبال قومیت کے محدود نظریہ کے سخت مخالف ہوگئے تھے۔ جس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ایسے بین الاقوامی نظام کی تمنا کرنے لگے جو اخوت اور اتحاد بشری، ہم آہنگی اور قوموں کے باہمی اتفاق، امن و آشتی پر استوار ہو اور جس میں عظمتِ انسانی کا بول بالا ہو۔ ان کا خیال تھا کہ جذبہ حب الوطنی اگر بلند مقاصد اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تو یہ کمزور اقوام کے استحصال کا سبب بھی بن سکتا ہے۔''

☆☆☆

پروین کمار اشکؔ

کا غزلیہ شاہکار ''دُعا زمین''

غزل اردو کی مقبول ترین اور معتوبِ زمانہ صنفِ سخن ہے۔ ناقدینِ ادب نے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ تنقیدِ غزل کے تعلق سے اردو غزل کے نقادوں کے ہاں مثبت اور منفی دونوں طرح کے رویّے پائے جاتے ہیں۔ اردو کے پہلے نقاد حالؔی نے غزل کو ''مخرب الاخلاق اور سوختی'' قرار دیا اور کلیم الدین احمد نے اس کے سر ''نیم وحشی صنفِ سخن'' کا الزام رکھا۔ رشید احمد صدیقی نے اردو غزل کا دفاع کرتے ہوئے اسے ''اردو شاعری کی آبرو'' کہا۔ فراقؔ گورکھپوری نے اِسے ''انتہاؤں کا سلسلہ'' (Series of Climax) قرار دیا ہے۔ اختر انصاری نے اِسے ''بلبلِ ہزار داستاں'' کہہ کر یاد کیا ہے۔ عظمت اللہ خاں نے غزل پر سخت تنقید کرتے ہوئے بے تکلفی سے اردو غزل کی گردن اُڑا دینے کا مشورہ تک دے ڈالا، وہیں آل احمد سرور نے اُردو غزل سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''غزل میں لفظ کو کائنات بنانے کا عمل ملتا ہے'' اس کے علاوہ عندلیب شادابی اور جوشؔ ملیح آبادی نے بھی غزل کی سخت مخالفت کی ہے۔ غزل پر تقریباً ہر زمانے میں اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔

ولیؔ دکنی سے غالبؔ اور غالبؔ سے عہدِ حاضر تک اس صنف نے ایک طویل سفر

طے کیا ہے۔غزل ہر عہد میں بحث کا موضوع رہی ہے۔غزل اس قدر سخت جان ہے کہ باوجود اپنی نازک مزاجی کے اس نے ہر دور میں تنقید کے نشتر کھا کے اپنے آپ کو زندہ رکھا۔

غزل زندہ دلانِ ادب کی جان اور ایمان ہے۔تاریخِ اُردو ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اکیسویں صدی تک پہنچنے کے لیے موضوعاتی اعتبار سے غزل نے ایک طویل سفر طے کیا ہے جو بدستور جاری ہے۔شروع شروع میں اردو غزل غمِ جاناں اور حدیثِ دلبراں تک ہی محدود تھی۔گُل و بلبل، شمع و پروانہ، حسن و عشق اور ساقی و مے خانہ اس کے خاص موضوع تھے اسی لیے غالؔب کو کہنا پڑا تھا:

''کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لیے''

آج کی اردو غزل نے زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا اور حالات کو بدلنا سیکھ لیا ہے۔اب اس میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی ہے کہ دنیا کے تمام موضوعات و مسائل اس میں سما سکتے ہیں۔اب اردو غزل کی تنگ دامانی کا گلہ کرنا بے معنی ہوگا۔

غزل ایک تہذیب کا نام ہے۔جس کا برِصغیر ہند و پاک اور بالخصوص ہمارے سماج سے گہرا تعلق ہے۔ہماری تہذیب کی جڑیں غزل میں اور غزل ہماری تہذیب کی جڑوں سے مربوط ہے۔اِن کو ایک دوسرے سے جدا کر کے سمجھنا لا حاصل ہوگا۔اردو غزل صدیوں سے لاکھوں دِلوں پر راج کرتی آئی ہے اور آج بھی پوری دنیا میں کروڑوں لوگ اس کے چاہنے والے ہیں۔غزل عہدِ طفلی میں تھی تو میؔر نے اِسے چلنا سکھایا، غالؔب نے اس کے سر پہ شفقت کا ہاتھ رکھا، داؔغ نے اسے جینے کا سلیقہ سکھایا، میر درؔد نے تصوّف کے مسائل سمجھائے، مومؔن نے اِسے اپنی محبوبہ کا درجہ دیا، حسرؔت نے اِس کی زلفوں کے پیچ و خم سنوارے اور آج غزل کا نکھرا ہوا روپ ہمارے سامنے ہے۔

شاعری کا ذِکر چھڑتے ہی غزل ہمارے ذہن کے دروازوں پر دستک دینے لگتی ہے اور اس کا نام کانوں میں رس گھولنے لگتا ہے۔ان دِنوں اردو رسائل و جرائد، اخبارات اور شعری مجموعوں کے ذریعے جو غزلیہ شاعری ہمارے سامنے آرہی ہے وہ بڑی مایوس کن

ہے۔شاید اسی لیے ہماری اردو غزل کے نقاد آج پھر غزل سے مایوس نظر آرہے ہیں۔آج کل کے زیادہ تر شاعر لفظوں کے اُلٹ پھیر سے یا تو اپنے پیش روؤں کو دُہرا رہے ہیں یا پھر اپنے آپ کو دُہرانے میں لگے ہیں۔اس مغالطہ میں کہ شاید کہیں فکروفن کا کوئی صدف ہاتھ آجائے اور ہم مالا مال ہو جائیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے عہد کے شاعروں کی ایک اچھی خاصی تعداد آج بھی روایتی غزل کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جو غزل برائے غزل کی تخلیق میں لگے ہوئے ہیں۔نیتجتاً ایسے ایسے شعری مجموعے منظرِ عام پر آرہے ہیں جن کے مطالعے کے بعد ایک آدھ سچّا شعر بمشکل ہاتھ آتا ہے۔شاعر کہلوانے کے شوق میں بے جان غزلیں کہنے والے ایسے شاعروں نے مجموعے چھپوا چھپوا کر صاحبِ کتاب ہونے کا حق تو حاصل کرلیا لیکن غزل کے اندر کوئی نئی بات پیدا نہ کر سکے۔چند معتبر ناموں کو چھوڑ کر یہی صورتِ حال ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ کئی سالوں کے بعد ایک ایسا شعری مجموعہ میرے روبرو ہوا جس کے ہر شعر میں ندرت ہے اور ہر شعر چونکانے والا ہے۔جو لوگ غزل سے مایوس ہو چکے ہیں وہ ''دُعا زمین'' کا مطالعہ فرمالیں اور پھر پوری ایمانداری کے ساتھ فیصلہ کریں کہ کیا اُن کا شعری وجدان سیراب نہیں ہوا؟ کیا پروین کمار اشکؔ کا یہ شعری مجموعہ اُردو غزلیہ سرمائے میں ایک گراں قدر اور یادگار اضافہ نہیں ہے؟

جب میں پروین کمار اشکؔ کے شعری مجموعہ ''دُعا زمین'' کا مطالعہ کرنے بیٹھا تو ہر شعر مجھے اپنی گرفت میں لیتا چلا گیا اور ہر شعر نے بار بار پڑھے جانے کی خواہش کو بیدار کیا اور شعور کی پرتوں کو کھولتا ہوا میرے حافظے میں محفوظ ہوتا چلا گیا۔

مرے خدا تری مخلوق سب سلامت ہو
دُعا یہ مانگوں جب اخبار سامنے آئے

زخم سمندر چاروں اور
بیچ غزل کا ٹاپو تھا

آنکھیں مرجاتی ہیں یار
اتنی دور نہ جایا کر

سفر ریل گاڑی کا طے ہو چکا
دُعا والا شہر اشکؔ آیا نہیں

جہاں مری کشتی ڈوبی تھی
دریا وہیں پر رُکا ہوا تھا

کئی برسوں سے عرضی زندگی کی گُم ہے دفتر میں
کبھی افسر نہیں ہوتا، کبھی بابو نہیں آتا

میں یہ بات بڑی ایمانداری، دیانت داری اور پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پروین کمار اشکؔ کا یہ شعری مجموعہ اردو غزل کے حوالے سے ایک معجزہ ہے میرے نزدیک اُن کا یہ شعری کارنامہ سینکڑوں مجموعوں پر بھاری ہے۔ دُعا زمین کی غزلیں بڑی شاعری کا خوبصورت تخلیقی اظہار ہیں۔ اس میں ذات، کائنات اور خدا کے درمیان کوئی فاصلہ نظر نہیں آتا! زندگی اپنی کُلیت کے ساتھ شعر در شعر ہمارے ساتھ سانس لیتی ہے۔

پروین کمار اشکؔ کا تعلق پنجاب کے شہر پٹھانکوٹ سے ہے۔ پیدائش یکم نومبر ۱۹۵۱ء لدھیانہ میں ہوئی۔ تعلیمی قابلیت سول انجینئرنگ اور پیشے کے لحاظ سے افسر

تعلقاتِ عامہ محکمہ آب پاشی (پنجاب) کے عہدے پر فائز ہیں۔ گذشتہ چالیس سال سے اُردو غزل کی آبیاری میں مصروف ہیں۔

پروین کمار اشکؔ کو اُردو غزل سے عشق ہے شاید اسی لیے انھوں نے اپنے گھر کا نام بھی ''غزلستان'' رکھا ہے۔ اُن کی غزلوں کے چار مجموعے ''دربدر'' (۱۹۸۰ء)، ''غزل تیرے شہر میں'' (۱۹۹۲ء)، ''چاندنی کے خطوط'' (۱۹۹۲ء)، ''دُعا زمین'' (۲۰۰۹ء) منظرِ عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

پروین کمار اشکؔ کی حصولیابیوں اور اعزازات کی فہرست طویل ہے جن میں شہنشاہِ غزل ایوارڈ، فراقؔ گورکھپوری ایوارڈ، غزل ہیرو ایوارڈ، غزل بھاسکر ایوارڈ، بہار اُردو اکادمی ایوارڈ اور محکمہ السنہ پنجاب کا ادبی ایوارڈ، بی۔ بی۔ سی لندن سے لائیو انٹرویو گذشتہ ۳۷ برسوں میں کوئی ۲۰۰ کے قریب ٹی۔ وی، ریڈیو پروگراموں میں ملکی سطح پر ادبی شرکتیں، ۵۰ سے زائد عالمی انتخابوں میں غزلیہ نمائندگی کم از کم ۴۰ عالم گیر سطح کے ادبی رسائل میں غزلوں کی اشاعت، سہ ماہی توازن کا گوشہء پروین کمار اشکؔ پاکستان لاہور کی ثقافتی تنظیم Melody کی طرف سے ۲ بار پاکستان آنے کی دعوت، کشمیر سے کنیا کماری تک درجنوں آل انڈیا، انڈو پاک مشاعروں میں امتیازی شمولیت، وزیرِ اعلیٰ پنجاب، گورنر ہماچل پردیش، سپیکر پنجاب ودھان سبھا کے دستِ مبارک سے ادبی تزئیں کاریاں شامل ہیں۔

اشکؔ نے اُردو غزل کے عالمی منظر نامے پر وارد ہو کر نئی اُردو غزل کو بڑا اعتبار بخشا ہے اور اِس کی خوشبو کو دور دور تک پھیلایا ہے۔ اُردو غزل کے نقادوں نے اشکؔ کی شعری انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں اُردو غزل کے معتبر شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ بڑے بڑے نقادوں نے ان کی غزل گوئی کے تعلق سے جو آراء پیش کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

''پروین کمار اشکؔ کی غزل کی یہی خوبی ہے کہ یہ قاری کو شاعر کے تجربات میں شریک ہونے پر آمادہ کرتی ہے اور اسی حوالے سے خود

قاری کو اپنے تجربات کی تہ تک پہنچنے کا موقع عطا کرتی ہے۔ یوں دو آئینے ایک دوسرے کے روبرو آکر دو عکسوں کے ایک لامتناہی سلسلے کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔" (ڈاکٹر وزیر آغا)

"آپ کی غزلوں میں بڑی جان اور بڑی چمک محسوس ہوتی ہے۔ میں مختلف رسالوں میں آپ کا کلام پڑھتا رہا ہوں۔" (احمد ندیم قاسمی)

"آپ کا لب ولہجہ انفرادیت کے جملہ اوصاف سے منور ہے آپ کے تجربات اور آپ کے اظہار کی روشنی انتہائی دل پذیر ہے۔"
(بلراج کومل)

زبان پر عبور کے تعلق سے ساقی فاروقی رقم طراز ہیں:

"میں تمہاری تازہ کاری اور زبان پر کنٹرول سے بے حد متاثر ہوا۔ مجھے اپنے آپ سے شکایت ہے کہ میں نے تمہیں پہلے دریافت کیوں نہ کیا۔" (ساقی فاروقی ،لندن)

"اُردو غزل کو نئی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کی دعوت دینے والے شاعروں میں پروین کمار اشکؔ ممتاز مقام کے حق دار ہیں۔
(ڈاکٹر انور سدید، پاکستان)

"پروین کمار اشکؔ کا شعری اسلوب اُردو شاعری کی ایک گراں قدر متاع ہی نہیں بلکہ اُردو شاعری کے لیے نیک شگون بھی ہے۔"
(پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ)

"پروین کمار اشکؔ ہندوستان کے اُن چند شعراء میں سے ایک ہے جنھوں نے ادھر اُردو غزل کے جمال کو رو بہ زوال نہیں ہونے دیا۔ پروین کی غزل میں جدید انداز کی نئی نئی جہتیں اور نئی نئی رتیں ہیں غزل میں وہ اپنی بات بڑی آسانی اور بڑی کامرانی سے صراط کر رہا

ہے۔''　　　　(ناصر شہزاد، پاکستان)

پروین کمار اشک نے اپنی غزلوں میں روزمرہ کی جن لفظیات کو استعمال کیا ہے اس کے بارے میں پروفیسر حامد کشمیری لکھتے ہیں کہ:

''پروین کمار اشک روایتی لفظ و پیکر کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتے۔ وہ مستقلاً روزمرہ زندگی سے الفاظ لیتے ہیں اور اُنہیں سوزِ نفس سے مرتعش کرتے ہیں۔ یہ الفاظ حقیقی زندگی سے لیے جانے کے باوجود فرضیت کی تشکیل کرتے ہیں اس سے اولاً تخلیقی اشعار خیالات کے اشعار سے ممیز ہوجاتے ہیں۔ دوئماً شعر کی قدرسنجی کے مسئلے کو آسان کرتے ہیں۔''　　　　(پروفیسر حامد کشمیری)

''غزل گو شاعروں کے ہجوم میں اپنی شناخت بنانا کوئی آسان کام نہیں لیکن پروین کمار اشک جلد ہی اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہوگئے۔''　　　　(منشایاد، پاکستان)

''پروین کمار اشک نئی نسل کے ایک منفرد اور ممتاز شاعر ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں اُن کی کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ بہت سے نقادوں نے اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔''　　　　(پروفیسر مغنی تبسم، حیدرآباد)

''پروین کمار اشک کے طرزِ اظہار نے صحرائے لالہ، خودرو کی طرح کنواری مٹی کے لمس سے پرورش پائی ہے۔''　　　　(مظہرامام)

ندافاضلی نے پروین کمار اشک کی شاعری کے بارے میں اپنی شعری عقیدت کا اظہار بڑے خوبصورت اور والہانہ انداز میں کیا ہے:

''تمہارے شعروں نے بار بار مجھے چونکایا میرے اکیلے پن کو گہرایا اور سمجھایا کہ پنجاب کے ایک علاقے میں اپنی برادری ہی کا ایک

بخارہ ہے جو اپنے پیدائشی زمین و آسمان سے مطمئین نہیں ہے۔
تمہاری جستجو کرب ناک ہے، لیکن یہی تمہاری تخلیقی قوت بھی ہے خدا
تمہارے ذہنی سکون کو اور بے سکون کرے تمہاری غزلیں پڑھتے
ہوئے کئی جگہ رکنا پڑا اور تمہارے واسطے سے اپنے بارے میں سوچنا
پڑا۔'' (ندا فاضلی، ممبئی)

''بڑے بڑے نقاد کہتے ہیں کہ اب غزل کے بارے میں کچھ کہنے کی
گنجائش نہیں رہی لیکن میرا خیال ہے کہ غزل ہی ایک ایسی صنف ہے
جس میں ہر دور میں نیا اضافہ ہوتا رہے گا۔ آپ کی غزلیں اس خیال
کو سچ ثابت کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہیں۔''

(محمد علوی، احمد آباد)

''پروین کمار اشکؔ کے کلام میں وہ تازگی ہے جو ذاتی تجربے کی دین
ہوا کرتی ہے۔'' (مخمورؔ سعیدی)

''اُن کی غزلوں کی زمینیں نئی ہیں۔ اشعار متنوع ہیں اور عام فضا سے
مختلف بھی، تازہ کاری اِن پر مستزاد ہے۔'' (پروفیسر شہریار)

''آپ کی غزلوں کی تازگی اور سادگی نے مجھے متاثر کیا۔ معمولی کو غیر
معمولی اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا فن کا معجزہ ہے۔ یہ معجزہ آپ
کے کلام میں کئی جگہ نظر آیا۔'' (شین۔ کاف۔ نظام)

ڈاکٹر بشیر بدر نے اشکؔ کے شعر کو دل میں چھپا کر رکھنے والے تحفہ سے تعبیر کیا
ہے وہ کہتے ہیں، آپ کی غزلوں سے زمین دار ہو رہا ہوں۔

''غزل ایک سفاک صنفِ سخن ہے اور پروین کمار اشکؔ نے اس
سفاک صنف کے ذریعے تمام دنیا کے لیے خیر اور سلامتی کی دُعائیں
مانگی ہیں۔ اشکؔ کا یہ غزلیہ مجموعہ ''کلّی طور پر دنیا کی سلامتی کا استعارہ

ہے۔ اُردو دنیا میں یہ استعارہ پہلی بار دنیا سے محبت اور امن وسلامتی
کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ دُعا استعارہ ہے خیر، بھلائی اور سلامتی کا
زمین استعارہ ہے، محبت، نیکی اور خوشحالی کا۔''

تم نے کیوں بارود بچھادی دھرتی پر
میں تو دُعا کا شہر بسانے والا تھا

پروین کمار اشکؔ نے دُعا، مذہب، خدا اور زمین کو اپنی ذات کے وسیلے سے سمجھا ہے اور بلاتفریق مذہب وملت پوری انسانیت کے لیے خیر کی دُعائیں مانگی ہیں۔ اشکؔ نے اپنی اُردو غزل میں دُعا کا استعارہ غالباً پہلی بار اتنی شدّت وحدّت اور تخلیقیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

نہ مسجدوں کی طرف ہیں نہ مندروں کی طرف
میری دُعائیں ہیں جلتے ہوئے گھروں کی طرف

کیا یہ مسجد ہے صرف مومن کی
کیا یہ کافر ہیں سب خدا کے بغیر

خدا کی بے رُخی پر رو رہی ہے
دُعا مجھ سے لپٹ کر رو رہی ہے

پروین کمار اشکؔ کی شاعری میں معصومیت اور سادگی اس قدر ہے کہ پڑھتے ہوئے اپنے بچپن کی حسین یادیں تازہ ہو جاتی ہیں جو اب لاشعور اور تحت الشعور کا حصہ ہیں۔

راہ میں پہلے سمندر آئے گا
میرے بچّے پھر ترا گھر آئے گا

میں ترا بے خواب بچّہ ماں بتا! میرے لئے
کوئی لوری کیوں نہیں، کوئی کہانی کیوں نہیں

بچپن کس دہلیز پہ مجھ کو چھوڑ گیا
یہ کہہ کر ''ٹھہرو'' میں کھلونے لاتا ہوں

عشق ایک فطری جذبہ ہے اور کہیں نہ کہیں اس جذبے میں جنسی تسکین کا تقاضا بھی چھپا ہوتا ہے۔ نئے زمانے کا عاشق وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے اب وہ پہلے کے عاشقوں کی طرح یک طرفہ عشق کا قائل نہیں ہے اور نہ ہی محبوب کی جدائی میں دشت وصحرا کی خاک چھاننے کو اپنے لیے لازمی تصوّر کرتا ہے بلکہ محبوب سے ملنے کے مواقع تلاش کر کے اُس کے وصل کی لذتیں حاصل کرتا ہے اور اُس کا قرب پا کر جنس ولمس کے تجربے سے بھی گزرتا ہے۔ جدید اُردو شاعری میں ہجر کے ساتھ ساتھ وصل کی تمام تر کیفیات اور جنسی وارداتیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ پروین کمار اشکؔ کے ہاں بھی عشق کے وہ سارے معاملات اور کیفیات موجود ہیں جن کا تعلق کسی تخیلاَتی محبوب سے نہیں، آب وگِل سے بنی ایک نوخیز چاندنی اور خوبصورت لڑکی سے ہے۔

وہ جو اِک پیڑ ہے صندل کا کسی کے گھر میں
اس کی خوشبو سے رہا ہے کبھی رِشتہ میرا

وہ لڑکی تو کب کی مرگئی یاد آیا
میں کس کو آواز لگانے والا تھا

دِل کے زخم پر مرہم کام نہیں کرتے
دِل کے زخم پر بوسہ رکھا جاتا ہے

اِک دِن اُس کے سامنے اشکؔ میں رویا تھا
اپنے کیے پر آج تلک پچھتاتا ہوں

غیر کے گھر کی لاج ہے وہ
میں بھی بچّوں والا ہوں

میں جس کی قربتوں میں جی لیا کرتا تھا وہ لڑکی
مری بے درد آنکھوں کو پرائی اچھی لگتی ہے

دیوار و در پہ شہر کے لڑکوں نے لکھ دیا
ہر لڑکی بے وفا ہے غزل تیرے شہر میں

غزل کی چاندنی دروازے کھول دیتی ہے
وہ بند کمرے میں ملبوس جب بدلتا ہے

دبائے رکھتا ہوں سینے میں جو یہ شعلۂ عشق
اسی سے اشکؔ مرا خاک دان روشن ہے

شوق سے کھا رہا ہے عشق مجھے
ذائقے دار ہوگیا ہوں میں

ملکی تقسیم کا المیہ کبھی نہ ختم ہونے والا ایسا کرب ہے جس کی دردناکیوں اور تباہیوں کو پرانی نسل نے جھیلا ہے ساٹھ سال کا لمبا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی تقسیم کے زخم مندمل نہیں ہوئے ہیں۔ تقسیم کے اس کرب کو نئی نسل نے بھی ذہنی سطح پر بڑی شدّت سے محسوس کیا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے اردو شعراء ادباء نے بہت کچھ لکھا ہے اور آج بھی لکھا جا رہا ہے۔ پروین کمار اشک نے ملکی سرحدوں کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کے خلوص ہی کا ایک حصہ ہے:

زمیں کو اے خدا! وہ زلزلہ دے
نشاں تک سرحدوں کے جو مٹا دے

محبت میں بدل جائے سیاست
خدا لاہور دلّی سے ملا دے

ملکی تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ سرحدوں کے درمیان اپنے ہی ملک میں مہاجر بن گئے۔ شہر گاؤں گلی کوچے سب ویران ہو گئے۔ بھائی بھائی سے جدا ہو گیا۔ بربریت کے اس ننگے ناچ نے لوگوں کو خون کے آنسو پینے پر مجبور کر دیا صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب کو داغ داغ اور تار تار کیا گیا۔ خون کے اس سیلاب میں لاکھوں گھر تباہ ہوئے اور لاکھوں جانیں چلی گئیں۔

بہت رویا میں دیواروں سے مل کر
مکاں خالی ہوا جب ساتھ والا

گھر کے اندر کوئی نہیں تھا
دیواروں پر نام لکھے تھے

اب میں اُس سرحد سے ٹکراتا ہوں سر
پار جس کے میرا بازو رہ گیا

اس سیاہ فام اور خون آشام دور میں ایسے لوگوں کا دم غنیمت رہا جن کے یہاں سچائی اور دیانت داری زندہ تھی۔

مہاجر کا مکاں خالی ہے لیکن
میں درکھولوں تو کوئی بددعا دے

پروین کمار اشکؔ ہندوستانی تہذیب کا ایک ایسا علم بردار شاعر ہے جو نہ صرف نئی روشنیوں اور تازہ ہواؤں کو خوش آمدید کہتا ہے بلکہ اپنے اجداد کی اُن جملہ روایات کو بھی زندہ رکھنا چاہتا ہے جو اب قصہء پارینہ بنتی جارہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کا دل اور آنکھیں کسی قسم کی تخفیف اور تقسیم کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔

بزرگوں کا بس اِک کمرا بچا کر
تو جب چاہے پرانا گھر گرا دے

جب دیوار اُٹھائی ہوگی
روح بہت چلاّئی ہوگی

پار کے منظر نے موقعے پر آنکھیں دیں
میں اندھا دیوار اُٹھانے والا تھا

بچے اشکؔ کو پاگل کہہ کر بھاگ گئے
وہ پریوں کی کتھا سنانے والا تھا

گرا چکا ہوں جو سو بار اپنے ہاتھوں سے
نہ جانے کیوں وہی دیوار سامنے آئے

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں انسانیت کا چہرہ پوری طرح مسخ ہو چکا ہے۔ ہمارا معاشرہ ترقی کے نام پر دن بہ دن زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے۔ انسانی اقدار پامال ہو چکی ہیں۔ صنعت و حرفت کی برق رفتاری نے انسان سے اُس کا چین و سکون چھین لیا۔ ہر طرف گھٹن، ذہنی تناؤ اور چیخ و پکار کا عالم ہے۔ معیشت کی غیر مساوی تقسیم نے غریب آدمی سے اُسکا اعتبار چھین لیا ہے۔ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ عدلیہ کا دروازہ کھٹکھٹانے اور انصاف کی دہائی دینے پر بھی مظلوموں کو انصاف نہیں ملتا۔ پروین کمار اشکؔ کے ہاں ان تمام تلخ اور دلدوز واقعات کا اظہار اشعار کے پیرائے میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہوا ہے۔

سمندر والے جس کو لے اُڑے ہیں
وہ بادل دشت سارے کے لیے تھا

مرا کردار بھی کر قتل یا رب
مجھے بھی شہر میں جینا سکھا دے

کون سخی ہے میں جس سے بھوکے پیٹ کا درد کہوں
کون کھلاوے عشق کا ٹکڑا سائیں! میرا کوئی نہیں

پروین کمار اشکؔ صوفیانہ مزاج لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ ذات پات، مذہب اور تفرقہ بازی سے آزاد وہ روح کی اُس سچائی کو پانا چاہتے ہیں جسے حاصل کرنے کے بعد دوئی اور من وتو کا فرق مٹ جاتا ہے اور انسانی روح درجۂ کمال تک پہنچ کر مالکِ حقیقی کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔

کیا یہ مسجد ہے صرف مومن کی!
کیا یہ کافر ہیں سب خدا کے بغیر!!

صحیفے ہوگئے ناراض اشکؔ سب مجھ سے!
یہ مجھ کو کون سا کلمہ پڑھا دیا اُس نے!!

یہ میری روح میں کیسی اذان روشن ہے
زمیں چمکتی ہے کُل آسمان روشن ہے

اشکؔ محض اکتسابی علم حاصل کرنے کے قائل نہیں ہیں وہ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ اُس تعلیم کے بھی خواہاں اور حامی ہیں جو انسانی روح کو بالیدگی اور ذہن کو کشادگی عطا کرے اور جو حقیقی معنی میں زندگی کو جینے کا سلیقہ اور شعور عطا کرے۔

اہلِ کتاب کو کون بتائے
الف کہاں پر چھپا ہوا ہے

تجھے سکول میں بھیجا ہے جس کتاب کے ساتھ!
بغور پڑھنا تیرا امتحان بھی ہوگا!!

کتنے بھاری ہیں بستے بچّوں کے
اِن میں کچھ پھول ڈال رکھا کرو

نہ پکڑی قافلے کی جس نے انگلی
وہ بچّہ سب سے آگے چل رہا ہے

بھیڑ کو چیرنا ہی پڑتا ہے
بھیڑ میں راستا نہیں ہوتا

ہم جس پُر آشوب دور میں جی رہے ہیں، اُس میں اپنے سائے سے محبت و رواداری سے پیش آنا، دنیاداروں کو سچ بولنے کی تلقین کرنا، انا کی دیوار گرانا، مثالی کردار پیش کرنے کی دعوت دینا، بے لباسی کے عُریاں موسم میں سروں پر چادر رکھنا، یہ سب گزرے زمانے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے دور کا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہوگا کہ لاش سڑک پر پڑی تڑپتی رہتی ہے لیکن اُسے اُٹھانے والا کوئی بھی سامنے نہیں آتا۔ سب تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں۔ خود غرضی انسان کی سرشت میں اس قدر شامل ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کے گھر کی آگ بھی اس لیے بجھاتا ہے کہ کہیں آگ اُس کے گھر تک نہ آپہنچے۔

تری بندوق کیا مارے گی مجھ کو
کہیں سے تیغ لا کردار والی

ہر دیوار کے پیچھے سو دیواریں ہیں
کتنی دیواریں میں ہر روز گراتا ہوں

جسم پہ کپڑا کہیں نہیں ہے
سر چادر سے ڈھکا ہوا ہے

جا پڑوسی کے گھر کی آگ بجھا
آگ کا کچھ پتا نہیں ہوتا

ترا پیشہ وکالت ہے تو تجھ کو
خدا سچ بولنے کا حوصلہ دے

میں ہمسایا ہوں تیرا اشک مجھ کو
ذرا سی دھوپ تھوڑی سی ہوا دے

سمندر چیختا اُس وقت پہنچا
مکاں پوری طرح جب جل چکا تھا!

الیکٹرانک میڈیا نے ہماری تہذیب وثقافت کی جڑوں کو اندر سے پوری طرح کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ بے حیائی اور فحش کلچر کے فروغ نے بزرگوں سے اُن کا کردار تک چھین لیا ہے۔ سیاست کا اژدھا ہر طرف منہہ پھاڑے کھڑا ہے۔ کلیوں کو مسلا جا رہا ہے اور تتلیوں کو نوچا جا رہا ہے۔ نوچ کھسوٹ کرنے والے بھیڑیے محافظ اور پیش رو بنے ہوئے

ہیں۔ دُعائیں دینے والے کردار فوت ہو چکے ہیں۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں کوئی کسی کو راستہ دینے کو تیار نہیں ہے۔

وہ پیش رو ہے مگر راستا نہیں دیتا
بزرگ ہو کے بھی دیکھو دُعا نہیں دیتا

وہ مرے پھول مری تتلیاں کہاں دے گا
جو ننگی شاخ کو پتہ ہرا نہیں دیتا

جدید کپڑے اُسے کیا جوانیاں دیں گے
جو بوڑھی سوچ کو چہرہ نیا نہیں دیتا

جب سے فوت ہوا ہے بوڑھوں کا کردار
بچّوں کو سمجھانے والا کوئی نہیں

ہمارے شہر میں اک ایسا کنبہ ہے جس میں
ترقی دیکھ کے بچّوں کی باپ جلتا ہے

پرندوں کو دِشائیں دینے والا
کوئی ہوتا دُعائیں دینے والا

جو سراپا دُعا نہیں ہوتا
ہاں وہ بوڑھا بڑا نہیں ہوتا

اشکؔ بزرگ دُعاؤں والے چلے گئے
موسم ٹھنڈی چھاؤں والے چلے گئے

نہ تیرے لب پہ دُعا نہ شفقتیں دل میں
بزرگ ہونے سے پہلے تو کاش مرجاتا

پروین کمار اشکؔ کا اس بات پر یقین ہی نہیں قوی ایمان بھی ہے کہ خدا تک ہر بندے کی رسائی نہیں ہوتی اور نہ ہی خدا اپنے راز سب پر منکشف کرتا ہے۔ جب کوئی بندہ روح کی کسوٹی پر خدا سے اپنے تعلقات استوار کر لیتا ہے پھر خدا اُس بندے پر اپنے تمام اسرار کھولتا چلا جاتا ہے۔

کسی کسی کو تھماتا ہے چابیاں گھر کی
خدا ہر ایک کو اپنا پتا نہیں دیتا

خدا کے بندو آؤ مل کر سوچیں
خدا بندوں کو کیوں ملتا نہیں ہے

نئی نسل کے سر پہ رکھ ہاتھ یا رب
زمیں پر دعا دینے والا نہیں ہے

اشکؔ کے شعروں میں استفہامیہ رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہیں کہیں تلخ تجربات کی بھٹی میں تپ کر تحکمانہ اور ناصحانہ اندازِ تخاطب بھی اُبھر کر سامنے آیا ہے۔

محبت کو سُنا ہے دل کے بدلے
عجائب گھر میں رکھا جا رہا ہے

مروت کی تجوری بند رکھنا
یہ سکّہ شہر میں چلتا نہیں

خدا کی بے رُخی پر رو رہی ہے
دُعا مجھ سے لپٹ کر رو رہی ہے

درد میرا ہے یوں دوا کے بغیر!
جیسے بچّہ کوئی دُعا کے بغیر

منافقت و مغائرت کے بڑھتے ہوئے رجحان کے سبب انسان گھر سے اور خود سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ ہم مزاج لوگوں کا فقدان کے سبب طبیعت کے اندر بازاری پن کے میلان نے خاندانوں میں انتشار وابتلا کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔

سیر بازار میں کرو لیکن
گھر کا بھی کچھ خیال رکھا کرو

خوشی اِک بے وفا لڑکی ہے پیارے
یہ شے گھر میں نہ رکھ بازار والی

اُس کا گھر بھی ہے نیک بیوی بھی
جانے کیوں ہوٹلوں میں رہتا ہے

موقع پرستی اور مصلحت اندیشی نے انسان سے اظہارِ حق بیانی کی آزادی چھین لی ہے۔ انسان دوستی، بھائی چارہ اور جذبہ ءایثار وقربانی کی جگہ مطلب پرستی اور مکر وفریب نے لے لی ہے۔ جس نے انسان کے اندر عدمِ تحفظ کے احساس کو گہرایا ہے۔

ندی دامن چھڑا کر جارہی ہے
کہ دریا خشک ہوتا جارہا ہے

یہ کس نے قتل کیا شہرِ خوش کلام مرا
میں جس سے بات کروں بے زباں نکلتا ہے

مجھ کو پیتے گئے پیاس اپنی بجھاتے گئے لوگ
اب تو صحرا کی طرح لگتا ہے دریا میرا

اشکؔ نے نازک ترین خیال کو بھی بہت ہی آسان الفاظ اور سادہ ودلکش اسلوب میں اس ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ شعر کی حلاوتیں اور تراوتیں روح کو تازگی اور پاکیزگی عطا کرکے معطر کردیتی ہیں، شعر پڑھیے اور لطف لیجئے، کیا جذبہ ہے واہ!!

خوشبو کو ناراض نہیں میں کرسکتا
پھول کو ڈرتے ڈرتے ہاتھ لگاتا ہوں

یاد ہے بچپن کا وہ کھیل؟
میں صیّاد تُو آہو تھا

جدید غزل کا ایک اہم موضوع پیسہ کمانے کی طمع میں وطن سے دوری، اپنی جڑوں سے کٹ کر پرائی آب وہوا میں آباد ہونے کا چلن، پلٹ کر نہ آنے کا غم اور کبھی نہ ختم ہونے والا انتظار، یہ وہ تمام انسانی رویّے ہیں جن کا دردناک اظہار اشکؔ کی غزلوں میں بڑی شدّت سے ہوا ہے۔

وطن سے دور اُڑتا جارہا ہے
کوئی روکو پرندا جارہا ہے

رات کی چھت پر اندھی ماں رستہ دیکھے
چاند کو لے کر بالک کب گھر آتا ہے

جو دانہ ڈھونڈنے نکلا تھا گھر سے
وہ پنچھی آج تک لوٹا نہیں ہے

یہ ہوسکتا ہے وہ آجائے مُڑ کر
مگر ایسا کبھی ہوتا نہیں ہے

زندگی کی لایعنی اور بے قدری ایک ایسی حقیقت ہے جس کی سچائی سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس سے ہر انسان زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور گزرتا ہے اس تجربے کی صداقت کو اشکؔ نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

تماشا گاہ میں کس کا تماشہ ہوتا ہے
تماش بینوں کو اس کا پتا نہیں ہوتا

جادو گر سر کاٹ رہا تھا
بچے تالی پیٹ رہے تھے

پروین کمار اشکؔ کے اشعار کی تازگی اور سادگی قاری کو فوراً اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور کیف و سرور کی ایسی وادیوں کی سیر کراتی ہے جہاں سے پلٹ کر آنے کو جی نہیں چاہتا۔

وہ میری آوارگی پر مُسکرا کر ایک دن
تھام لے گا ہاتھ میرا اپنے گھر لے جائے گا

بہت سوں کو رہائی مل چکی ہے
میرے بارے میں سوچا جارہا ہے

مجھ سے رکھ اتنا فاصلہ پیارے
تیری کمزوریاں نہ دیکھ سکوں

کبھی ہم جس کی چھت پر کھیلتے تھے
سنا ہے آج وہ گھر ڈھے گیا ہے

پروین کمار اشکؔ بنیادی طور پر انسان دوست شاعر ہیں۔اُن کی شاعری کا غالب

رجحان بھی انسانی رواداری اور عالمی امن ہے۔ جیو اور جینے دو کا فلسفہ دُنیا کی سلامتی کا ضامن ہے۔ اُن کی غزلوں سے ایسے سینکڑوں اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں تعمیری سوچ کو فروغ دینے کی بات کی گئی ہے۔

تم نے کیوں بارود بچھادی دھرتی پر
میں تو دُعا کا شہر بسانے والا تھا

تمام دھرتی پہ بارود بچھ چکی ہے خدا
''دُعا زمین'' کہیں دے تو گھر بناؤں میں

پھول کو زخم تم بناتے ہو
زخم کو پھول میں بناتا ہوں

اشکؔ کی دُعاؤں کا خدا کے گھر سے رشتہ بڑا مربوط ہے وہ شہرِ دُعا کا نہ صرف یہ کہ رمز شناس ہے بلکہ تمام مخلوق کے حق میں خدا سے سلامتی کی دُعائیں بھی مانگتا رہتا ہے۔ اُس کی روح کے اندر نہ جانے کیسی پیاس چھپی ہے جو قطرہ قطرہ سمندر نچوڑ لینے کے بعد بھی سیراب نہیں ہوتی:

شہرِ دُعا کو رستہ کہاں سے مڑتا ہے
نقشہ دے یہ نکتہ میں سمجھاتا ہوں

خدا کے فضل سے روشن مری دُعا کا گھر
مری دُعا سے خدا کا مکان روشن ہے

مرے خدا! تیری مخلوق سب سلامت ہو!
دُعا یہ مانگوں جب اخبار سامنے آئے

خدا کی طرح چمکتا ہے دل کے شیشے میں
دُعا کا آنسو کہاں آنکھ سے نکلتا ہے

اردو غزل کے حوالے سے ناصؔر کاظمی، پروین شاکر، شجاعؔ خاور، ندؔا فاضلی، بشیؔر بدر، ظفؔر اقبال، احمد فراز، میر تقی میر، قتیؔل شفائی، شکیب جلالی، منیؔر نیازی، محمد علوی اس لیے مشہور ہیں کہ ان کے اشعار سہل ممتنع کی خوبی سے متصف ہیں اور فوراً دل میں اتر جاتے ہیں! عہد حاضر میں پروین کمار اپنے ہم عصروں میں اس لیے ممتاز ہیں کہ ان کے درجنوں اشعار اپنے سحر کار اسلوب، سادگی، گہرائی اور ندرتِ خیال کے باوصف ہمیں فوراً یاد رہ جاتے ہیں اور ہماری تنہائیوں میں ہمارے زخموں کو سہلاتے ہیں۔ پروین کمار اشکؔ نے اُردو غزل کو بالکل نئے مکتبہ فکر سے آشنا کیا ہے جس کی مثال اُردو غزل کی دُنیا میں دور دور تک نہیں ملتی۔

پروین کمار اشکؔ نے اپنی شاعری میں کوئی نعرہ بلند نہیں کیا اور نہ ہی اُن پر کسی تحریک سے جڑے ہونے کا لیبل چسپاں کیا جاسکتا ہے۔ دُعا زمین کا جو تصور اُن کے سامنے ہے وہ اُن کی شاعری کے مطالعے سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اُن کے تمام شعر زندگی کی معنی خیزی کو بیان کرتے ہیں۔ آسان زبان میں اتنے گہرے شعر اور کہیں نہیں ملتے۔ اُن کے شعروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک بار پڑھنے کے بعد ہی یاد ہو جاتے ہیں۔

پروین کمار اشکؔ نے اُردو غزل کو نئے ابعاد عطا کیے ہیں، اُن کی شاعری کا ڈکشن جدید تر ہے۔ اُن کے یہاں روایت کی پاسداری تو ملتی ہے روایت کی اندھی اور گمراہ کن تقلید نہیں۔ وہ رسمی شعر گوئی کو اپنے لیے ذلت تصور کرتے ہیں۔

اُن کی بعض پوری کی پوری غزلیں سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہیں۔اُن کی ہر غزل میں تین چار اشعار ایسے ضرو ہوتے ہیں جنھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔انھوں نے کہیں بھی اپنی شاعری میں مبہم قسم کی علامتیں اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں۔اُن کے ہاں بظاہر ترسیل و ابلاغ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ شعر پڑھتے ہی فوراً سمجھ آجائے۔معنی و مفہوم تک پہنچنے کے لیے شعر کی گہرائی میں اُترنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

غضنفر اپنی شخصیت

اور

فکر و فن کے آئینہ میں

غضنفر ۹/مارچ ۱۹۵۳ء میں موضع چوراؤں ضلع گوپال گنج بہار میں پیدا ہوئے۔ مسلم معاشرتی رواج کے مطابق اُن کے تعلیمی سلسلے کا آغاز مذہبی تعلیم سے ہوا۔ اُنھیں ایک مدرسے میں داخل کرادیا گیا لیکن مدرسے کے پابند، تنگ اور خشک ماحول، نیز حافظ صاحبان کی بے رحم چھڑی کی مار نے جلد ہی اُنھیں مدرسے سے مکتب میں پہنچا دیا۔ مدرسے سے رشتہ منقطع ہو جانے کے بعد بھی مذہب سے اُن کا تعلق بنا رہا اور ہائر سکینڈری تک آتے آتے یہ تعلق کافی پائیدار ہو گیا۔ بلکہ آگے چل کر یہ تعلق جنون کی صورت اختیار کر گیا۔ تبلیغی جماعت کی پُر اثر تعلیمات اور گردو پیش کی خانقاہی فضا نے جنّت اور دوزخ کا ایسا پُرکشش اور ہولناک نقشہ کھینچا اور عبادات واذکار کا ایسا چسکا لگایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ثواب بٹورنے، دین کمانے اور خدائے بزرگ و برتر کا قرب حاصل کرنے کے چکر میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ اُس زمانے کے اُن کے دوست واحباب اور عزیز و اقارب بتاتے ہیں کہ اُن دِنوں حالت دیوانگی میں غضنفر عجب قسم کے حالات و تجربات سے دوچار ہوئے۔ مثلاً یہ کہ انھوں نے لوگوں میں جنّت کی کوٹھریاں تقسیم کیں، کبھی خود کو شیو شنکر محسوس کیا اور کبھی اپنے آپ کو

ابلیس تصور کیا۔

غضنفر پرائمری اسکول چوراؤں گوپال گنج سے پہلی اور پرائمری اسکول قطب چھپرہ سیوان سے پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد اسکول سیمرا، تھاوے گوپال گنج میں داخل ہوئے (اُن کی ذہانت کو دیکھ کر اُن کے اُستاد اور گارجین نے ان کے لئے دوسری، تیسری اور چوتھی جماعت کو ضروری نہیں سمجھا) سیمرا اسکول سے مڈل، وی۔ایم۔ایم۔پی۔ ایچ سیکنڈری اسکول گوپال گنج اور گوپال گنج کالج سے (۱۹۷۳ء) میں بی۔اے کرنے کے بعد غضنفر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہا (ایم۔اے۔اُردو) مگر چونکہ اُن کے والد صاحب کی نظر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی امیج اچھی نہیں تھی، اس لئے اُنھیں بہار یونیورسٹی مظفر پور میں داخل ہونا پڑا۔ مگر اُردو پڑھنے کی اُن کی ضد برقرار رہی (والد صاحب اردو سے بھی بدظن تھے) اتفاق سے اُنہیں دنوں جے۔پی تحریک نے زور پکڑا اور اُس نے بہار یونیورسٹی میں تالا لگوا دیا اور اس طرح غضنفر کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دروازے کھل گئے۔

علی گڑھ آ جانے کے بعد اُن کے والد صاحب کے غصّے کا پارہ اتنا بڑھا کہ اخراجات کے پیسے آنے بند ہو گئے لیکن جب پہلے سمسٹر میں غضنفر کے نمبر کلاس میں سب سے زیادہ آئے تو والد صاحب کے غیظ وغضب کا پارہ اُتر کر نیچے آ گیا اور منی آرڈروں کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔

غضنفر نے ۱۹۷۶ء میں امتیاز کے ساتھ ایم۔اے پاس کیا اور ۱۹۸۲ء میں "شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات" پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۷۹ء میں شعبۂ اردو میں عارضی لیکچرار کی حیثیت سے درس وتدریس کا کام بھی انجام دیا، مگر اُن کی نوکری دوستی کی نذر ہو گئی اور وہ بے کار ہو گئے۔ اِسی بے کاری کی حالت میں اُنھیں شادی کرنی پڑی اس لئے کہ لیکچررشپ ملتے ہی اُن کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تھی۔

طالب علمی کے زمانے میں غضنفر کی ادبی سرگرمیاں کافی زوروں پر تھیں۔ وہ انجمنِ

اُردوئے مُعلیٰ کے سیکریٹری بھی منتخب ہوئے اور اسی زمانے میں علی گڑھ میگزین کی مجلس اِدارت کے ممبر بھی رہے۔ اس زمانے میں وہ چھپے بھی خوب، بعض دوستوں نے اُن پر بسیار نویسی کا الزام لگایا مگر اُن کا قلم نہیں رکا۔

ریسرچ کے زمانے میں جن دنوں وہ مالی مشکلات سے دو چار تھے، جامعہ اردو اور پراکٹر آفس میں پارٹ ٹائم جاب بھی کی۔ ۱۹۸۲ء میں یونین پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں بے دلی سے شریک ہوئے مگر کامیاب ہو کر وزارتِ تعلیم و سماجی بہبود، حکومت ہند جس کا موجودہ نام وزارتِ فروغ انسانی وسائل ہے کے ایک لسانی ادارے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز میسور سے منسلک ہو گئے اور تقریباً دس گیارہ سال اُردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر سولن میں بحیثیت لیکچرر کم جونیر ریسرچ آفیسر کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۹۳ء میں یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں پھر شریک ہوئے اور منتخب ہو کر اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنو میں پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا۔

۱۹۹۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک انٹرویو فیس کیا اور اُن کا تقرر شعبہء اردو میں ریڈر کے عہدے پر ہو گیا۔ تین سال تک وہ وہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ چوں کہ ریڈر کی وہ پوسٹ مستقل نہیں تھی، اس لئے دوبارہ وہ اپنے سابقہ عہدے پر لکھنو لوٹ آئے۔ آپ ناردن ریجنل لینگویج سینٹر پٹیالہ میں پرنسپل کی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ انہی دنوں منسٹری آف ایچ۔ آر۔ ڈی۔ ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشنل گورنمنٹ آف انڈیا نے انھیں NCPSL بڑودہ کے ڈائریکٹر کا ایڈیشنل چارج بھی سونپا آجکل آپ اکادمی برائے فروغِ استعداد اُردو اساتذہ نئی دہلی کے ڈائریکٹر ہیں۔ آپ کے دوست واحباب کا حلقہ بھی کافی وسیع ہے۔ یہاں اُن ناموں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو آپ کے بہت ہی قریب ہیں اور جنھوں نے اردو ادب میں اپنی ایک خاص پہچان بنا لی۔ مثلاً ابو الکلام قاسمی ،خورشید احمد، سید محمد اشرف، ابن کنول، شارق ادیب، پرویز جعفری، نسیم صدیقی، آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس، مہتاب حیدر نقوی، حیدر صدیقی، اظہار ندیم، محی الدین اظہر، پیغام

آفاقی، طارق چھتاری، غیاث الرحمان اور علی احمد فاطمی وغیرہ۔

غضنفر صاحب کو اساتذہ بھی کافی اچھے ملے، مثلاً شہر یار، قاضی عبدالستار، خلیل الرحمان اعظمی، خورشید الاسلام نسیم قریشی، نور الحسن نقوی، اطہر پرویز، نعیم احمد، نادر علی خان، شمیم حنفی، عتیق احمد صدیقی، ثریا حسین وغیرہ۔

غضنفر صاحب نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ غزلیں اور نظمیں دونوں لکھیں۔ علی گڑھ میں شہر یار صاحب سے اصلاح لی بعد میں ڈرامے، افسانے اور ناول لکھے۔ پہلا افسانہ ''بڑی کاٹ کا سوٹ'' ماہنامہ ''بڑھتے قدم'' دلّی میں غالباً ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔

غزلیں، نظمیں ہندوستان کے تمام اہم رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ پہلا ڈراما ''کوئلے سے ہیرا'' (ہندی میں) ۱۹۷۱ء میں چھپا۔ پہلا ناول ''پانی'' ۱۹۸۹ء میں، دوسرا ناول ''کینچلی'' ۱۹۹۳ء، تیسرا ناول ''کہانی انکل'' ۱۹۹۴ء، چوتھا ناول ''مم'' رسالہ ذہنِ جدید میں چھپا، پانچواں ناول ''دویہ بانی'' ۲۰۰۱ء فسوں اور وِش منتھن ۲۰۰۴ء میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

دیگر تصانیف میں:

۱۔ مشرقی معیارِ نقد۔

۲۔ زبان وادب کے تدریسی پہلو

۳۔ تدریس شعروشاعری وغیرہ شامل ہیں۔

زیرِ طبع تصانیف:

۱۔ خواب کے پاؤں (شعری مجموعہ)

۲۔ لسانی کھیل

۳۔ شبلی کے تنقیدی نظریات (تحقیقی مقالہ)

۴۔ حیرت فروش (افسانوی مجموعہ)

اتر پردیش اور بہار اردو اکیڈمی کی طرف سے آپ کو جن ناولوں اور کتابوں پر ایوارڈ مل چکے ہیں اُن میں ''پانی''، ''کینچلی''، ''کہانی انکل''، ''دویہ بانی''، ''مشرقی معیارِ نقد'' اور تدریسِ شعروشاعری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

غضنفر کے فن اور شخصیت پر مختلف یونیورسٹیوں میں ریسرچ ہو رہی ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہء اردو کے ایک اِسکالر کو ''غضنفر ایک منفرد ناول نگار'' کے عنوان پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ جموں، سرینگر اور میرٹھ یونیورسٹی میں بھی غضنفر کے فن اور شخصیت پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، این۔ سی۔ پی۔ یو۔ ایل اور مختلف یونیورسٹیوں کی جانب سے کروائے گئے سیمیناروں کو غضنفر نے نہ صرف یہ کہ خود اٹینڈ کیا ہے بلکہ وہ خود بھی درس و تدریس کے پیشے سے جڑے ہونے کے سبب اردو زبان و ادب اور لسانیات کے مختلف موضوعات پر متعدد سیمینار اور ورکشاپس کروا چکے ہیں۔

اپنے پہلے ناول ''پانی'' سے اردو دنیا کو چونکانے والے غضنفر آج کے اردو فکشن کا ایک معروف و معتبر نام بن چکے ہیں۔ اُن کی ناول نگاری کے بارے میں اردو کے نقادوں نے جو آراء پیش کی ہیں۔ اُن سے غضنفر صاحب کے فن کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> ''پانی'' سے لے کر ''فسوں'' تک انھوں نے ہر ناول میں زبان و بیان کے الگ الگ تجربے کئے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیانیے کا لہجہ خود متعین کیا ہے اور اسی لہجے کے ذریعے پُرانے متنوں کے آہنگ میں نئے مفاہم رکھ دئے ہیں اور مفاہم ہمارے عہد کی حقیقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ (انیس اشفاق)

> انہوں نے بعض نئی اور موثر چیزیں ناول میں داخل کی ہیں۔
> (شمس الرحمان فاروقی)

> ''نئی نسل بالعموم زبان پر اتنی قدرت نہیں رکھتی'' غضنفر کے نئے انداز

بیان نے چونکا دیا ہے۔ (مسعود حسین خاں)

ناول میں جس طرح کی غیر وحدانی اور مختلف الآہنگ اسلوب کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی تشکیل کے لئے غضنفر غالباً اس عہد کے سب سے اہم ناموں میں شمار کئے جائیں گے۔ (مولا بخش)

''پانی'' کی حوصلہ افزا پذیرائی کے بعد توقع تھی کہ ''کینچلی'' میں بھی غضنفر پانی ہی کا آزمودہ اسلوب اپنائیں گے۔ لیکن غضنفر نے جرأت مندی سے کام لے کر کینچلی میں بالکل دوسرا رُخ استعمال کیا۔

(نیّر مسعود)

''کہانی انکل''، غضنفر کا ایک منفرد مگر کامیاب تجربہ ہے۔ جس میں سابقہ روایات سے ہٹ کر ناول کے فارم کو ایک نئی شکل دینے کی سعی کی گئی ہے۔ (قیصر اقبال)

پروفیسر قمر رئیس ''دویہ بانی'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس میں موضوع، فکر، تکنیک اور بیانیہ کی مکمل ہم آہنگی نے جس (Realistic Poetic Form) کو جنم دیا ہے اور اس میں استعاروں اور علامتی اظہار نے نہایت خاموشی سے فکر و نظر کی جو کھڑکیاں کھولی ہیں وہ قاری کو ایک نئے جمالیاتی احساس سے متعارف کراتی ہیں۔

''یہ ناول دلت مسئلے کو لے کر بہت دور تک جائے گا۔ اس کی ساری کی ساری زبان ہندی آمیز اردو ہے۔'' (گوپی چند نارنگ)

''واقعی غضنفر آج اردو فکشن کا بہت اہم اور شہرت یافتہ نام ہے۔ لیکن یہ شہرت انھوں نے ادبی ریاکاری اور افسانوی کرتب بازی یا شاعرانہ مکر و فریب سے حاصل نہیں کی جیسا کہ ان دنوں عام ہے۔ یہ

شہرت اور سعادت انھوں نے واقعی اپنی ریاضت، محنت، شخصیت کی سادگی اور ایمانداری اور فنکارانہ ذمّے داری کو باہم متھ کر فکشن کا ایک فطری راستہ اپنا کر حاصل کی۔ (علی احمد فاطمی)

خورشید احمد ''فسوں'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''فسوں'' اردو میں غالباً پہلی کامیاب مثال ہے۔ کیمپس ناول کی غضنفر نے یونیوسٹی کی پیچیدہ لائف اور کرداروں کے تخلیقی جنون (Creative madness) کو اپنے قلم کی گرفت میں لیا ہے۔ یہ اِن کا بڑا کمال ہے۔ غضنفر کے لئے پیشن گوئی بھی ہے کہ جب آدمی پر نسل وژن کر لیتا ہے۔ تو پھر اُس کو ادبی تاریخ سے کوئی بھی نہیں مٹا سکتا۔

عرفان صدیقی ناول ''دویہ بانی'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''غضنفر کا یہ ناول ''دویہ بانی'' بہت سے سوال اٹھاتا ہے اور استحصالی نظام کے خلاف فکر اور عملی جدو جہد کی دعوت دیتا ہے۔ یہ فکری پہلو ناول کی بڑی خصوصیت ہے۔ جو اُسے ہم عصر اردو فکشن میں ایک اہم تخلیق بناتی ہے۔ جس کے لئے غضنفر مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

غضنفر صاحب کی شخصیت کے بارے میں اُن کے دوست علی احمد فاطمی نے لکھا ہے کہ:

''غضنفر ایک سیدھے سادے، شریف اور مخلص انسان ہیں۔ اُن کے مزاج میں سادگی، فطرت میں کُھلا پن ہے۔ اُن کی شخصیت پیچیدگی سے عاری ہے۔ غضنفر پہاڑ پر ۱۱ سال رہے۔ پہاڑوں کی وسعت وہاں کے لوگوں کی سادگی ذہن و دل کی آزاد روش نے اُن پر کافی اثر ڈالا ہے۔ یہ اثر اُنکی تخلیقات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

بشیر مالیر کوٹلوی: ایک تعارف

سرزمینِ مالیر کوٹلہ نے دو باکمال مالیر کوٹلوی پیدا کئے ہیں۔ ایک شہاب مالیر کوٹلوی، دوسرے بشیر مالیر کوٹلوی۔ دونوں کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بشیر مالیر کوٹلوی کی افسانوی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ممبئی سے شائع ہونے والے اُردو ادب کے موقر ماہنامہ ''شاعر'' نے مئی جون ۲۰۱۰ء کے شمارے کا ایک گوشہ بشیر مالیر کوٹلوی کے فن اور شخصیت کے لیے مختص کیا ہے۔

سرورق چھپی بشیر صاحب کی تصویر نہایت جاذبِ نظر ہے۔ جس میں چہرے کی متانت، متجس آنکھیں اور خوش لباسی ایک مکمل کہانی بیان کر رہی ہے۔ گوشے کے شروع میں بشیر صاحب کے مکمل کوائف درج کیے گئے ہیں۔ ایک صفحہ اُن تصاویر کے لیے مختص کیا گیا ہے جن میں بشیر مالیر کوٹلوی مشاہیرِ ادب کے ساتھ کسی نہ کسی ادبی تقریب میں شریک رہے۔ بشیر صاحب کا ایک طویل انٹرویو شاعر کے مدیر افتخار امام صدیقی نے بعنوان محمد بشیر مالیر کوٹلوی سے ادبی مکالمہ گوشے میں شامل کیا ہے۔ جس میں موصوف کے فن اور حیات کا احاطہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کی تمام پرتوں کو کھولنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

مالیر کوٹلہ سے باہر بہت کم لوگوں کو پتا ہوگا کہ بشیر صاحب ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے مصوّر بھی ہیں۔ اُن کی تخلیق کردہ تصاویر اور پوٹریٹس کے عکس بھی شاعر کے ایک صفحہ پر اُبھارے گئے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں فنِ مصوری پر بھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ گوشہ کے آخر میں ایک افسانہ بعنوان ''بیٹا'' اور چار

افسانچے بالترتیب ''کہرام''، ''انکشاف''، ''قدم قدم دوزخ'' اور ''معمولی بات'' شامل کیے گئے ہیں۔

اس میں دورائے نہیں کہ بشیر جز وقتی مصوّر اور کُل وقتی افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی اصل پہچان ہی افسانوں کے ذریعے سے ہے۔ بشیر اُردو افسانے کا بڑا نام نہ سہی لیکن اُردو افسانچے کا ایک معتبر نام ضرور ہے۔ بشیر نے اُردو افسانچے کی دنیا میں اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ اب تک اُن کی کہانیوں کے تین مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ نہ جانے بشیر کے اندر کون سا لاوا ابھرا ہے جو کبھی ''قدم قدم دوزخ''، کبھی ''سُلگتے لمحے''، کبھی ''چنگاریاں'' کی شکل میں ہمارے سامنے آرہا ہے۔ اُن کے افسانچوں کا ایک مجموعہ ''جگنوشہر'' کے عنوان سے زیرِ ترتیب ہے۔

بشیر گذشتہ چار عشروں سے اُردو افسانے لکھ رہے ہیں۔ اس دوران انھوں نے کسی ادبی تحریک یا ازم کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور نہ ہی سستی شہرت کی خاطر کسی ادبی فیشن یا فارمولے کو اپنایا۔ اس سلسلے میں وہ خود رقمطراز ہیں۔

> ''میں کسی ترقی پسند ادیب سے متاثر نہیں ہوا، نہ کسی کا رنگ لیا، ہر ادیب اپنے دور کو لکھتا ہے میں اپنے دور کا احتجاج لکھ رہا ہوں۔ احتجاج کے علاوہ مرا ذہن کسی دوسرے موضوع کو مشکل ہی سے قبول کرتا ہے، جنسی چٹخارے اور جاگتی آنکھوں کے رومان پرور خواب مجھے کبھی نہیں بھاتے۔''

بشیر کی کبھی کہانیوں میں شروع سے آخر تک تحیّر اور تجسس کی فضا قائم رہتی ہے۔ اُن کی زیادہ تر کہانیوں کا اختتام طنزیہ کاٹ لیے ہوتا ہے۔

دیپک بُدکی نے لکھا ہے کہ:

> ''بشیر مالیرکوٹلوی اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے رومانی اور جنسی چٹخارے کو ترک کر کے سماجی اور سیاسی بے ضابطگیوں کے

خلاف آواز بلند کرنے کو اپنا شعار بنالیا۔''

بشیر مالیرکوٹلوی کی افسانہ نگاری کے تعلق سے گوشے میں جن ناقدینِ ادب نے اپنی آراء پیش کی ہیں اُن میں مجتبیٰ حسین، قمر رئیس، جوگندر پال، دیپک بدکی، قاضی مشتاق احمد، طارق کفایت، ناشر نقوی، رام لعل، ہیرا نند سوز، شکیل الرحمٰن، وھاب اشرفی، اسلم جمشید پوری اور پروفیسر محمود عالم کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ:

''بشیر کی کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ پڑھنے میں جلدی ختم ہوجاتی ہیں لیکن احساس میں دیر تک چلتی رہتی ہیں آپ کی بعض کہانیوں کو نہ جانے میں نے کب پڑھا تھا لیکن یہ اب تک میرا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔''

قمر رئیس نے بشیر کی کہانیوں سے اپنے ایقان و اُمید کو یوں ظاہر کیا ہے۔

''محمد بشیر کو قدرت نے مشاہدہ اور تخیل کی وہ صلاحیتیں عطا کی ہیں جن کی ضرورت ہر بڑے افسانہ نگار کو ہوتی ہے اگر کچھ کمی ہے تو اظہار و بیان کی نئی سمتیں ڈھونڈنے یا ایسی جرات کی جو تکنیک میں نت نئے تجربے کرنے پر اُکساتی ہے۔ لیکن جو اعتماد کی ایک خاص منزل پر آتی ہے۔ مجھے امید ہے وہ منزل دور نہیں جب محمد بشیر کی کہانیاں اُردو افسانہ کو ایک نئی جمالیاتی میزان سے ہم کنار کریں گی۔''

بشیر کی کہانیوں کا ایک نمایاں وصف اُن کا اختصار اور واقعات کو من وعن بیان کرنا ہے۔ بقول قاضی مشتاق احمد:

''بشیر واقعات کی سچائیوں کو جوں کا توں تسلیم و انکار کے بغیر پیش کرنے کا فن جانتا ہے۔ اسی لیے میں اسے سچائیوں کا نقیب کہتا ہوں۔ اس کی آنکھ جو کچھ بھی دیکھتی ہے وہ آپ کے لب پر آسانی

سے آجاتا ہے۔ بشیر اپنی ہر کہانی میں کڑوی سچائی کو کڑوے کریلے کے رس میں گھول کر پیش کرتا ہے۔ لیکن اتنی خوبصورتی کے ساتھ کہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس نے اِسے شہید میں گھول کر پیش کیا ہے۔ بشیر کے اس جذبے کی داد دیتا ہوں کہ کوئی بات چھپا کر بیان نہیں کرتا۔''

بشیر اپنے اردگرد اور ملک و بیرونِ ملک رونما ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں جب بھی کوئی نیا موضوع یا واقعہ کسی اخبار یا ٹی۔وی کی اہم سُرخی بنتا ہے تو بشیر اپنی پوری توجہ اُس موضوع پر مرکوز کردیتے ہیں اور ہر زاویے سے اُس پر غور کرنے کے بعد ایک خوبصورت کہانی تخلیق کردیتے ہیں۔ اس سے اُن کی بصیرت اور خلاقی کا پتا چلتا ہے۔

بشیر کی کوشش بھی یہی رہتی ہے کہ موضوعات نئے اور اچھوتے ہوں۔ وہ پامال راہوں کو ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ اِسی لیے جلتے اور سلگتے ہوئے موضوعات ہی اُن کی پہلی پسند بنتے ہیں۔

''لوحِ بدن'' کا شاعر: پریم کمار نظرؔ

پریم کمار نظرؔ پنجاب میں اُردو غزل کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ اُن کا ایک ہی شعری مجموعہ ''لوحِ بدن'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ پریم کمار نظرؔ نے بدن اور جنسی تجربات کے اظہار کے لیے شعر کو ترسیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ اُردو شاعری میں ''جنس'' کوئی اچھوتا موضوع نہیں ہے۔ اکابرینِ ادب نے بھی عشقیہ شاعری کی آڑ میں جنسی شاعری بڑے چٹخارے لے کر کی ہے اور ننگی شاعری کر کر کے دفتر کالے کیے ہیں۔ دبستان لکھنو کی قدیم نسل نے تو جنسی شاعری کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ جس میں انھوں نے پستان، عضو تناسل، انزال، مساس وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ تاریخِ اُردو ادب کے مطالعے ہی سے یہ عقیدہ کھلتا ہے کہ لکھنو کی امن وامان، خوشحالی اور فراغت والی زندگی اور وہاں کی طرزِ معاشرت نے انھیں فحش گوئی کی طرف راغب کیا۔

بدن میں اس سہی قد کے ہوگیا تلِ
الف میں دیکھ لو نقطہ کہاں ہے
(وزیرؔ)

تمہارے پائجامے میں پنہا ہے جلوۂ خوبی
دبالی گلبدن نے حسن کی جاگیر چٹکی میں
(منیرؔ)

لکھنو ہی کیا غیر لکھنوی شعراء کے یہاں بھی یہ روش پائی جاتی ہے اور کہنے والے ہر دور میں اس طرح کے شعر کہتے رہے ہیں۔

پہلے کالی جھاڑیاں ، پھر سُرخ ٹیلے ، گہری ندی
جسم کے اندر سفر کے مرحلے درپیش ہیں
(نامعلوم)

سینے پہ دو صراحیاں ، مے خانہ زیرِ ناف
پینے کا تب مزا ہے ---------------!!

ہر چند کہ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کی باتیں کرنا ہے لیکن غزل کو بدن کے حصار میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ غزل نے باوجود اپنی نازک مزاجی کے کائنات کے ہر پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے اور ہر بھاری سے بھاری موضوع کو اپنے اندر سمیٹا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ غزل کے اندر جنسی موضوعات کا اظہار ممنوع ہے بلکہ جنسی موضوعات کی پیش کاری میں بھی ادب اور سلیقہ درکار ہے۔

غزل ایک تہذیب کا نام ہے۔ ایک ایسی تہذیب جو اشاروں، کنایوں میں بات کرتی ہے۔ مباشرت کے نقشے کھینچنا غزل کا شیوا نہیں ہے۔ غزل پردہ داری کا نام ہے ایسی پردہ داری کہ جس میں ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں'' والا معاملہ کارفرما ہو۔

پریم کمار نظؔر کی شاعری جنسی لوازمات کی شاعری ہے۔ نظؔر کی انفرادیت یہی ہے کہ انھوں نے بدن کے لطیف احساسات اور جنس کے فطری تقاضوں اور تجربوں کو غزل میں برتا ہے۔ اُن کے بعض اشعار میں اجنتا اور ایلورا کے بتوں کے عکس ابھرتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ایسے نسوانی پیکر جن کے بدن کا لمس، رنگ، خوشبو اور ذائقہ جنسی جذبات کو مہمیز کرتا ہے۔ لوحِ بدن کی تصاویر کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ کوئی شعری مجموعہ نہیں بلکہ

کوکھ شاستر یا کاماسُتر کا کوئی نسخہ ہو۔ جس میں نسوانی جسم اپنی تمام تر رعنائیوں، تابنا کیوں اور توانائیوں کے ساتھ کھلم کھلا جنسی عمل کی دعوتیں دیتا ہے۔

رکھ دی ہے اُس نے کھول کے خود جسم کی کتاب
سادہ ورق پہ لے کوئی منظر اتار دے

پریم کمار نظر کے یہاں بدن سراپا زبان بن جاتا ہے اور ہر سمت سے آواز دینے لگتا ہے۔ جسم کی یہ آوازیں ہر عضو کی سطح پر خود کو ظاہر کرتی ہیں اور مخالف جنس کو جنسی عمل کے لیے پکارتی ہیں۔

مجھ کو ہر سمت سے آواز لگانے والے
حدِ فاصل بھی کوئی رکھ کہ ادھر جاؤں میں

نظر کے یہاں جنسی ناآسودگی، نارسائی، نامرادی اور ناکامی کے ایسے تجربات بھی بیان ہوئے ہیں جب جسم کا دریا اترنے کے بعد دوُر دوُر تک ندامت کی ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

بکھری ہوئی ہے ریت ندامت کی ذہن میں
اُترا ہے جب سے جسم کا دریا چڑھا ہوا
اگرچہ شور بہت کوچۂ ہوس میں ہے
وہ کیا کرے کہ جو چالیسویں برس میں ہے

وہ جسم کُھل رہا ہے گرہ در گرہ نظرؔ
یہ تیر چوک جائے گا ڈھیلی کماں نہ رکھ

ہمارا عہد عشق کی قدروں کے انحطاط سے منسوب ہے۔ عشق کی قدریں یکسر بدل گئی ہیں۔ موبائل کلچر کے اس دور میں عشق ''دل لگی'' اور ''ٹائم پاس'' کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ اب نہ کوئی کسی پر مرتا ہے اور نہ کوئی کسی کی خاطر اپنی جان دیتا ہے اور نہ کوئی کسی کے ہجر میں گھٹ گھٹ کر تنہا زندگی گزارتا ہے۔ آج زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح عشق میں بھی ویٹنگ لسٹ والا معاملا کارفرما ہے۔ تو نہیں تو اور سہی اور نہیں تو اور سہی والا یہ رویہّ عام ہو گیا ہے۔ آج کا معشوق بھی پہلے جیسا معصوم اور ایماندار نہیں رہا۔ وہ بھی ایک وقت میں کئی کئی عاشقوں کے ساتھ جنسی رابطے رکھتا ہے۔ عشق کا وہ دور اب ختم ہو چکا ہے جب شاعر کہا کرتا تھا۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

بہت عرصے پہلے بمل کرشن اشکؔ نے کہا تھا جو آج کے دور پر صد فیصد صادق آتا ہے۔

کل کے پھول کی پتی کب تک کالے کوٹ پہ ٹانکے پھریے
رنگ برنگے باغیچوں میں پنکھڑیوں کی کون کمی ہے

نظرؔ کے یہاں معشوق محض ایک جسم ہے۔ جس کے کچھ جنسی تقاضے بھی ہیں اور جو وصل کی گھڑیوں میں جنسی ارتباط و اختلاط کی راحتیں بھی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

وہ مُنہ سے کچھ نہیں کہتا کہ پیش و پس میں ہے
بدن کا کرب تو ظاہر نفس نفس میں ہے
بدن آواز بن کر گونجتا ہے
عجب دشتِ ہوس کا سلسلہ ہے
اس جسم کا لحاظ بھی کرنا پڑا مجھے
اندھے کنویں میں روز اُترنا پڑا مجھے

پریم کمار نظؔر کے یہاں نہ فکر کی بلندی ہے اور نہ خیال کی پاکیزگی، رومانی جذبات بھی اُن کے ہاں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اگر چہ اُن کی شاعر بنیادی طور پر بدن اور جنس کی شاعری ہے لیکن انھوں نے ننگی شاعری ہر گز نہیں کی۔

شاعری زندگی کے مختلف رنگوں سے عبارت ہے۔ ہر شاعر کے یہاں موضوعات کی رنگا رنگی کے باوجود زندگی کا کوئی ایک خاص رنگ بہت واضح اور نمایاں بھی ہوتا ہے۔ لوحِ بدن کی شاعری یک رنگی شاعری ہے۔ جس میں بدن اور جنسی تجربات کو پیش کیا گیا ہے۔ بیان کی سادگی اور تجربے کی انفرادیت نظؔر کو اپنے ہم عصر شعراء میں الگ پہچان عطا کرتی ہے۔

☆☆☆

خوش فِکر و خوش خیال شاعر
آزاد گورداس پوری

آزاد گورداس پوری اُردو غزل کا ایک معتبر نام ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے انجینیئر (ریٹائرڈ) ہیں۔ اُردو غزل کے وہ پنجابی شاعر جو کبھی کبھی یا ہمیشہ پنجاب سے باہر رہے مثلاً بانی، کمار پاشی، کرشن موہن، گوپال متل، ارمان شہابی، کرشن کمار طور، پریم پال اشک، مہندر پرتاپ چاند وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ آزاد گورداس پوری کا نام بھی ان شعراء کی فہرست میں شامل ہے جو کسبِ معاش کے سلسلے میں ہمیشہ پنجاب سے باہر رہے۔

آزاد نے اپنی شاعری میں جن شعری روایات کو سمیٹا ہے۔ اُن کا سلسلہ ابوالفصاحت حضرتِ جوش ملسیانی سے جا ملتا ہے۔ اس گھرانے کے شاعروں کے بارے میں مشہور ہے کہ:

''جنابِ جوش کے شاگرد بھی اُستاد ہوتے ہیں''

بلا شبہ آزاد گورداس پوری بھی اُستادی کے مرتبے پر فائز ہیں۔ اپنی عمرِ عزیز کی ۷۷ بہاریں دیکھ چکے ہیں اور تصنیفی و تخلیقی زندگی کے ۵۷ سال مکمل کر چکے ہیں۔ اس عرصے میں اُن کی ۶۰۰ سے زیادہ غزلیں اور ۶۰ سے زیادہ کہانیاں ہندو پاک کے علاوہ بنگلہ دیش، جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ کے ادبی رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ اُن کی

سب سے پہلی غزل (پنجابی میں) ماہنامہ ''پگڈنڈی'' امرتسر میں جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس شمارے میں آزاد کے علاوہ پاکستان کے جناب عبدالمجید بھٹی ، پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ،ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ،فدا حسین فدا ایسی برگزیدہ ہستیوں کا کلام بھی شائع ہوا تھا۔ ان حضرات میں سب سے کم عمر آزاد گورداس پوری ہی تھے۔

آزاد کو پدم شری ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی' تلمیذ و جانشین فیصح الملک حضرت داغ دہلوی ، پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم لاہور۔ پاکستان اور ماہرِ علمِ عروض پروفیسر بلخی کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔

''مضرابِ نگاہ'' آزاد کا تازہ ترین شعری مجموعہ ہے۔ جس کو انھوں نے عروض کی مروجہ بارہ بحور کے تیس (۳۰) اوزان میں مکمل کیا ہے۔ اُن کے اِس مجموعے کو ۱۶ دسمبر ۲۰۰۷ء کی شام کو ایک تقریب میں پنجاب کے LT. Gen. Shri.B.K.N.Chibbar نے اپنے دستِ مبارک سے ریلیز کیا تھا اور اِسی مجموعہ کو سال کا بہترین شعری مجموعہ قرار دیتے ہوئے دس ہزار روپے کے چیک ،اونی شال اور توصیفی سند سے نوازا جا چکا ہے۔ اب تک آزاد کے سولہ شعری مجموعے منظرِ عام پر آ کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یوں تو انھوں نے نظمیں ، گیت ، رُباعیات ،قطعات وغیرہ بھی لکھے ہیں لیکن اُن کی پسندیدہ صنفِ شاعری غزل ہی ہے۔

آزاد گورداسپوری غزل کہتے وقت دو باتوں کا بطورِ خاص خیال رکھتے ہیں۔ کلام سہلِ ممتنع میں ہو اس کے لیے شگفتہ زبان استعمال کی گئی ہو۔ وہ غزل کے مزاج سے خوب واقف ہیں ،انھیں کھردری زبان قطعی پسند نہیں ہے۔

میں آزاد گورداس پوری سے کبھی ملا تو نہیں ہوں لیکن فون پر اُن سے بارہا گفتگو ہوئی ہے اُن کی شائستگی اور لہجہ کے دھیمے پن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے انسان ہیں اور ایک اچھا انسان ہی اچھی شاعری کر سکتا ہے۔ بقول شاعر:

''لہو جیسا ہو ویسا بولتا ہے''

راقم نے اکثر و بیشتر اُن کا کلام رسائل و جرائد کے ذریعے سے پڑھا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اُردو شاعری کی اقدار اور روایات کا پورا خیال رکھا ہے اور اپنی شاعری کو کسی مخصوص نظریے کے فروغ کا وسیلہ نہیں بنایا۔ خیال کی پاکیزگی اور فکر کی عطر بیزی اُن کے کلام کو شگفتگی عطا کرتی ہے۔ شعر کہتے وقت شعری متروکات اور زبان کی صحت کا بھی پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ زبان و بیان کا نکھرا اور ستھرا پن اُنکی شاعری کا خاصا ہے۔ زبان و بیان پر انھیں پوری دسترس حاصل ہے۔ اُن کی اپنی طبیعت کی روانی کا اظہار مضمون آفرینی اور معانی آفرینی کی صورت میں غزل کے پیرائے میں ہوا ہے۔ آزاد گورداس پوری ناپ تول کر شعر کہتے ہیں۔ ضرورتِ شعری اور مضمون کی مناسبت سے موزوں ترین الفاظ کا استعمال کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ الفاظ خود بخود ضرورتِ شعری کے تحت اُن کے ذہن کے دروازے پر دستک دینے لگتے ہیں۔

غزل رمز و کنایہ میں بات کرتی ہے۔ غزل کا فن رمز و اشاریت ہی کا فن ہے۔ اچھا شعر وہی ہے جس میں پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون اور بلند سے بلند خیال کو بھی اشاروں میں اس طرح بیان کیا گیا ہو کہ ترسیل کا مسئلہ بھی پیدا نہ ہو۔ چھپا چھپا کے تجلّی دکھانے کا ہنر ہی غزل کا اصلی فن ہے ورنہ تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور دیکھنے والا جلوہء کوہِ طور سے محروم رہ جاتا ہے۔ آزاد کے شعروں کی روشنی آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی، ذہن و دل کے دریچوں کو روشن و منوّر کرتی ہے۔

تیرگی میں سرتا، پا غرق ہو نہ جائیں گے
تیرے حُسن سے رشتہ قطع کرلیں ہم کیسے؟

تو ہے تو گلستاں میں قحطِ سر خوشی کیسا
دیکھ کِھل اُٹھیں کلیاں تیرے مُسکرانے سے

اگر آہ میں تاثیر ہو تو مظلوم کی آہوں سے پتھر بھی پگھل جاتا ہے۔ قفس میں رہ کر بھی گُلشن کی تصویر آنکھوں میں رہتی ہے۔ ایک حرفِ تسلّی بھی دلِ مجروح کے زخم کا مرہم بن جاتا ہے اور جب اُمید کا سرگم خاموش ہو تو زلفِ پریشاں کا کوئی گیت بھی مزہ نہیں دیتا۔ اِسے خوبیِ قسمت کہا جائے یا خرابیِ تقدیر کہ جب زندگی انسان کو اُس مقام پر لے آئے جہاں ''نشاطِ غم'' اور ماتمِ طرب بھی باقی نہ رہے۔

یہ کس مقام پہ لائی ہے زندگی کہ جہاں
نشاطِ غم بھی نہیں ، ماتمِ طرب بھی نہیں

گوارا آپ کی چاہت بھی ہے عداوت بھی
شکایت آپ سے جب بھی نہیں تھی ، اب بھی نہیں

آنچل سے چھن رہی ہیں مُسلسل تجلّیاں
پردا اگر یہی ہے تو ، جلوا کِسے کہیں

ہو کسی میں کوئی خامی تو اُچھالتی ہے اُس کو
مگر اپنا عیب دُنیا کبھی دیکھتی نہیں ہے

ضبطِ غم کی تحریریں آ گئی ہیں چہرے پر
اور بھی ہوا افشا رازِ دل چُھپانے سے

ٹھوکریں کھا کھا کر ہی حیات سنبھلتی ہے، رنج و غم کے پہاڑوں ہی سے خوشیوں اور شادابیوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ جس طرح پھول اور کانٹے کا ربطِ باہمی ایک لازمی اور

فطری تعلق ہے اسی طرح ہر خوشی کے پہلو میں کچھ نہ کچھ غم تو ضروری امر ہے۔ اگر ایسا نہ ہو اور زندگی رنج و غم اور دشواریوں، پریشانیوں سے خالی ہو تو زندگی بے کیف و بے مزہ ہو جاتی ہے۔ گرنا اور گر کر سنبھلنے میں ہی زندگی کی کامیابی کے راز مضمر ہیں۔ گرم سرد، ہار جیت، اُتار چڑھاؤ، خوشی غمی، ہنسنا رونا، پانا کھونا، دھوپ چھاؤں اور ملنا بچھڑنا زندگی کی یہ وہ کیفیات و جذبات ہیں جو زندگی کو رنگا رنگی عطا کرتے ہیں۔ ایک ہی رنگ اور ایک ہی طرز پر گزرنے والی زندگی بے معنی سی لگتی ہے۔ جب تک حیات اپنے تمام رنگوں اور ذائقوں کے ساتھ جلوہ افروز نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ ہر حال میں جینے کا ہنر اور سلیقہ وہی شخص جانتا ہے جس کو زندگی کا گہرا شعور ہو اور جس کے پاس فہم و ادراک کی مضبوط کسوٹی ہو۔

شرط یہ ہے کہ جینے کا، ہم میں کچھ سلیقہ ہو
ورنہ زندگی اپنی، شعلہ بھی ہے، شبنم بھی ہے

ہاتھوں میں لئے پھرتی ہے دنیا کئی سورج
ذہنوں کا مگر پھر بھی اندھیرا نہیں جاتا

سُلگ کے زخم دِکھاتے ہیں راستا مجھ کو
یہی تو کرتے ہیں منزل سے آشنا مجھ کو

مری آنکھوں نے وہ بھی پڑھ لیا ہے
ترے چہرے پہ جو لکھا نہیں ہے

کُھلی جو چشمِ بصیرت تو سامنے آئی
جو اک ذات چھپی پردہء حجاب میں تھی

آزاد نے اپنی شاعری میں لفظوں کے پھول بھی کھلائے ہیں اور اُن میں معانی کی خوشبو بھی پیدا کی ہے۔ شعر گوئی ایک مشکل فن بھی ہے اور ایک حسین اور سخت ریاضت بھی۔ جس میں لاکھوں سیرتنِ شاعر کا لہو خشک ہوتا'' تب کہیں جا کے نظر آتی ہے اِک مصرعِ تر کی صورت'' آزاد کے تمام مصرعے ''تر'' بھی ہیں اور ''خوب تر'' بھی۔

چمن سے ربط قائم کیا ہو ، اُن خانہ خرابوں کا
نہیں دیکھا جنہوں نے جانفزا موسم گلابوں کا

وقت سے میرا گلہ اِس کے سوا کچھ بھی نہیں
بات ساری سُن رہا ہے، بولتا کچھ بھی نہیں

کون سا ہے یہ مقامِ آرزو ، کیا جانیئے
اُس کو چاہا ہے بہت، جس سے کوئی رشتا نہیں

پہچان مجھ کو چہروں کی دشوار ہوگئی
آئنہ تم نے توڑ کے اچھا نہیں کیا

روشن ہوا ہے جب بھی جہاں میں کوئی چراغ
کب سر پھری ہواؤں نے پیچھا نہیں کیا

جو چاہے دے مجھے تو درد و کرب کی دنیا
مگر یہ زہر میں ڈوبی فضا نہ دے مجھ کو

میرے رفیق مری اس قدر نہ کر توصیف
مری انا سے خدارا ملا نہ دے مجھ کو

یہ آزاد گورداسپوری کی انکساری ہی ہے کہ انھوں نے کبھی بھی اپنے تئیں بڑا شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی وہ اپنے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند شاعر ہیں اور حقیقت پسندی ہی اُن کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ اُن کے کلام کی سادگی، شگفتگی، دلکشی اور برجستگی حساس طبیعت لوگوں کے ذہن کو متاثر ضرور کرتی ہے۔

تمہارے پاس تو دینے کو کائنات بھی تھی
سوال کرنا ہمیں کو مگر نہیں آیا

میرا جو حالِ زار ہے اُس کی خبر ہے سب تجھے
میں نے دراز اس لیے دستِ دُعا نہیں کیا

دل میں بس گیا ہے وہ اس طرح کہ کیا لکھوں
فکر ہے لفافے پر اُس کا کیا پتا لکھوں

ہم کہاں تک ظلم کا دیتے جواب
اپنے گھر میں پھول تھے، پتھر نہ تھے

☆☆☆

ناکامیوں، محرومیوں اور تنہائیوں کا شاعر

سدرشن کنولؔ

سدرشن کنولؔ مالیر کوٹلہ کا ایک ایسا شاعر جس کو جانتے تو سبھی تھے لیکن پہچانتا کوئی نہیں تھا۔ مالیر کوٹلہ کے ہر چھوٹے بڑے شاعر نے سدرشن کے درشن ضرور کیے ہیں۔ شہر کے رئیسوں اور دانشور حضرات نے کنولؔ کی مجبوری اور کمزوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے تھوڑے سے پیسوں اور نشے کے عوض کنولؔ سے ٹھیکے پر غزلیں لکھوائیں اور پھر انھیں اپنے نام سے چھپوایا اور سنایا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہر پھول اپنی خوشبو سے پہچان لیا جاتا ہے۔

رئیس زادوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ رات کے اندھیرے میں چھپ چھپا کر طوائف کے کوٹھے پر جایا کرتے تھے اور طوائف کی دلکش و دلفریب اداؤں پر فریفتہ ہو کر اپنا سب کچھ لُٹا دیتے تھے لیکن زمانے میں بدنامی کے ڈر سے طوائف کو اپنی منکوحہ بنا کر اپنے گھر لانے کی جرأت شاید ہی کبھی کسی نے کی ہو۔ ایسا ہی کچھ حال ہمارے شہر کے اُن شاعروں کا بھی ہے جو سدرشن کنولؔ سے فیضیاب تو ہوتے رہے لیکن جز مرحوم ریاض خلجی کنولؔ کی شاگردی کا دم کسی نے نہیں بھرا۔ خاکسار کو بھی کنولؔ صاحب سے اصلاح لینے کا شرف حاصل ہے یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میرے تعلقات مرحوم خالدؔ کفایت صاحب سے کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر ذرا کشیدہ ہو گئے تھے۔ انہی دنوں میں ریاضؔ خلجی کے ذریعے کنولؔ صاحب کے رابطے میں آیا۔ چند ایک غزلوں پر اصلاح لینے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ شاعری

کا میرا اپنا رنگ کہیں کھو گیا ہے اور یہ شاعر بھی اپنے مزاج کا نہیں ہے۔ بہت جلد کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے سچے دل سے توبہ کی اور دوبارہ خالدؔ صاحب کے خیمے میں داخل ہو گیا۔

سدرشن کنولؔ کے سنِ پیدائش کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب پیدا ہوئے۔ نواب شیر محمد خان انسٹی چیوٹ کے مجلّہ ''جدید شعرائے مالیر کوٹلہ'' میں اُن کا سنِ پیدائش ۱۹۴۳ء لکھا ہوا ہے۔ اُن کے شعری مجموعہ ''دشتِ جنوں'' میں ۱۹۴۰ء ہے اور میری تحقیق کے مطابق جو انھوں نے مجھے خود لکھوایا تھا وہ ۱۹۳۷ء ہے۔ بہر حال یہ موضوع مزید تحقیق کا طالب ہے۔

کنولؔ کا پیدائشی نام سدرشن کنول ہے۔ والد بختاور چند جو پیشے کے لحاظ سے پٹواری تھے، والدہ بچنی دیوی، تعلیمی قابلیت مڈل، ملازمت کا آغاز میونسپل کمیٹی میں بطور منشی کیا۔ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ملازمت ترک کرنا پڑی۔ بعد ازاں ایک مقامی پرنٹنگ پریس میں ملازمت اختیار کی۔ مالیر کوٹلہ کے استاد شاعر کمال الدین کمال اور پریم وار برٹنی کے آگے زانوئے تلمذ طے کیے۔ سدرشن کنولؔ نے ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اپنے استاد پریم وار برٹنی کے ہمراہ فلمی دنیا کا بھی رُخ کیا جہاں فلمی دنیا کی مشہور ہستیوں بطورِ خاص دھرمیندر، مینا کماری، ساحر لدھیانوی، گلشن باوا اور ریش چوپڑہ ایسے لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی رہا اور فلموں کے لیے گیت لکھنے کا موقع بھی ملا۔

ملکِ خدا تنگ نیست ، پائے گدا لنگ نیست

لیکن فلمی دنیا ہر کسی کو راس نہیں آتی، وہاں وہ دیئے ہی جلتے ہیں جن میں خوشامد کا تیل ہوتا ہے۔ استاد شاگرد دونوں بحالتِ مجبوری مالیر کوٹلہ لوٹ آئے۔ کچھ عرصے بعد پریم وار برٹنی نے خوبصورت شہر چنڈی گڑھ کو متمکن کیا اور سدرشن کنولؔ اپنے وطنِ مالوف مالیر کوٹلہ ہی کے ہو رہے اور ۲۲/اپریل ۲۰۰۹ء کو اپنی آخری سانس لینے کے بعد ملکِ عدم کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

سدرشن کنولؔ کی شاعری ٹھہرے ہوئے زرد موسموں کی شاعری ہے۔ جس میں نہ

ختم ہونے والی تنہائی اور سناٹے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ایک ایسی کیفیت کی شاعری جس میں خوشی اور غم ایک دوسرے میں مُدغم نظر آتے ہیں۔ کنول کی شاعری میں اُلجھاؤ ہے نہ بکھراؤ اگر کچھ ہے تو صرف وقت کا ایسا ٹھہراؤ جہاں سارے موسم ایک جیسے لگتے ہیں۔لاتعلقی کا ایسا عالم ہے کہ انقلاباتِ زمانہ اور آتے جاتے موسموں کے رنگ بھی شاعر کے شب وروز اور ذہن ودِل کی کیفیت کو بدل نہیں پاتے۔

''جدید شعرائے مالیر کوٹلہ'' میں پروفیسر ڈاکٹر زینت اللہ جاویؔد صاحب نے لکھا ہے کہ:

''سدرشن کنولؔ کے روز وشب میں ایسے معمولات نہیں جنھیں اُن کی کتابِ زیست کے ہم ابواب کہہ سکیں۔تنہا تنہا سا ایک دُبلا پتلا شخص جو اپنی شاعرانہ ہئیت سے بھی پہچانا جاتا ہے۔فکروسوچ میں ڈوبا ہوا بازار میں کبھی کبھی کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔جیسے ہمہ وقت فکرِ سخن میں ڈوبا ہو۔ ہوش میں ہو کر بھی ہوش سے ماورا، دورانِ گفتگو بھی کوئی عالمانہ نکات نہیں۔لیکن جب شعر کہتے ہیں تو فکروفن اپنی بہار دِکھاتے ہیں۔ذہن ودِل میں آتش فن کے شرارے جب بے چین کر دیتے ہیں تو اشعار کاغذ پر اُتر آتے ہیں اور پھر بے رحم وقت کے ہاتھوں نہ جانے کدھر کہاں کھو جاتے ہیں کہ خود شاعر کو بھی پتہ نہیں چلتا۔اُن کی غزلیں پڑھنے کے بعد ہی محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی کُہنہ مشق شاعر کا کلام ہے۔اُن کی انفرادیت جانی پہچانی سی ہے کہ جہاں کہیں اور جس کسی کے پاس ہوتی ہے سدرشن کنولؔ کی یاد دِلاتی ہے۔''

سدرشن کنولؔ کی اس سے بڑھ کر تیرہ بختی اور کیا ہوگی کہ وہ کہیں اپنے عیب سے جانا گیا ہے اور کہیں اپنی غیر موجودگی میں اپنے ہُنر سے پہچانا گیا ہے۔

ہر طرح سے مجھے پہچان رہی ہے دنیا
عیب جاتا ہے کہیں میرا ہُنر جاتا ہے

کتنے بے بھاؤ بک گئے ہیں کنولؔ
وہ ترے شعر و شاعری کے گہر

کنولؔ نہ صرف یہ کہ عشق و محبت کی راہوں سے گزرے ہیں بلکہ انھوں نے کوچہ، جاناں تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد تقاولِ حسن کو پہچانتے ہوئے نسوانی جسم کی گرمیوں اور نرمیوں کا ذائقہ بھی چکھا۔

ہمیں بھی تھی کنولؔ اِک نازنیں سے
وہ جذباتی وہ جسمانی محبت

قطعہ:

غُسل کرنے کے بعد وقتِ سحر
بام پر جب کبھی وہ آتے ہیں
دیکھ کر اُن کو بے حجاب کنولؔ
میرے جذبات چونک جاتے ہیں

انسانی رویّوں میں سے ایک رویّہ یہ بھی ہے کہ انسان بعض اوقات زندگی کی تمام حقیقتوں کو سمجھتے ہوئے بھی لاعلمی اور لاتعلقی کا اظہار کرتا رہتا ہے اور کبوتر کی طرح آنکھیں موند کر بیٹھا رہتا ہے۔ اپنے اس رویّے سے دراصل وہ خود کو ہی دھوکا دیتا ہے۔

ہر طرح زیست کو سمجھتے ہیں
پھر بھی ہم لوگ جیسے بچے ہیں
اور کیا ہو متاعِ قلب حزیں
خود فریبی کے چند سکّے ہیں

اکثر و بیشتر ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے وجود پر جھوٹ کی ایک دبیز چادر اوڑھ

کر ہلاکت خیز خوش فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر وہی انسان بہت زیادہ خوشی، غم یا غصے اور نشے کی حالت میں جھوٹ کی اُس چادر کو اُتار پھینک کر سچ اُگلنے لگتا ہے۔

جب ذرا سا نشے میں آؤں گا
کون ہوں ، کیا ہوں ، پھر بتاؤں گا

خوابوں کا بے دام نشہ ہے
ہم ہیں صبح و شام نشہ ہے

دِن بھر سخت مشقت کرنا
اور پھر اپنا کام نشہ ہے

کنولؔ اپنی شاعری کی طرح ذاتی زندگی میں بھی بہت سادگی پسند اور خوددار طبیعت کے مالک تھے۔ ہر کس و ناکس کے آگے ہاتھ پھیلانے سے گریز کرتے تھے۔
بقول کنولؔ:

''میں نے اپنی طلب پوری کرنے کے لیے پیسوں کے بدلے میں غزلیں بیچی ہیں۔''

وہ کبھی بھی اپنے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہے انھیں اپنی تباہ حالی اور خانماں خرابی کا شدید احساس تھا جس کا برملا اظہار وہ اپنی گفتگو اور اشعار میں بھی کرتے رہے ہیں۔
اس تعلق سے ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس کے راوی مشتاق وارثی ہیں۔

''ایک روز سدرشن کنولؔ صحرا نوردی کرتے ہوئے مقامی کمبوج ہائی اسکول میں مشتاق وارثی صاحب سے ملنے جا پہنچے۔ علیک سلیک کے بعد کنولؔ صاحب نے وارثی صاحب سے سگریٹ مانگا اور سُلگانے

لگے۔ وارثی صاحب نے ازراہِ مذاق پوچھا۔

''کنولؔ صاحب آپ کے پاس دوسو روپے ہیں؟''

کنولؔ صاحب نے جواب دیا۔'ایک مدّت ہوگئی دیکھے نہیں۔۔''

جب وارثی صاحب نے دیکھا کہ کنولؔ صاحب معاملے کی نزاکت کو سمجھ نہیں پائے تو کنولؔ صاحب سے کہا۔

''میں نے یہ اس لئے پوچھا ہے کہ پبلک پلیس پر بیڑی سگرٹ پینے کا دوسو روپے جرمانہ ہے۔ سدرشن کنولؔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر اسکول سے باہر جا کر سگرٹ سلگانے لگے۔''

اپنی تنگ دستی اور بدحالی کے باوجود انھوں نے اپنے نامُساعد حالات کی کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی۔ ہر چند کہ اُن کی خستہ حالی خود انھیں کی پیدا کردہ تھی لیکن اس کے لیے وہ صرف کاتبِ تقدیر کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

مجھ کو کسی بشر سے شکایت نہیں کوئی
تحریر تھا جو میرے مقدر میں ہو گیا

دوستوں میں تلاش کر خود کو
اور پھر اپنے اعتبار کو دیکھ

جینا محال کیوں نہ لگے اس غریب کو
ہر راستہ ہو جس کے لیے زندگی کا بند

سدرشن کنولؔ نے اپنی زندگی کا سفر تنہا طے کیا ہے۔ اُس نے کسی کو اپنا دوست اور ہمراز نہیں بنایا۔ اپنی آوارہ مزاجی اور شعری جنون کے سبب اُس نے محبتوں کا گھر بھی آباد نہیں کیا۔ اُس کے اپنے ہی ذہن و دِل میں کہیں زندگی جیسے کھوگئی ہو، شام کے سناٹے اُسے

راس آتے ہیں۔ ایسے میں وہ اپنے ذہن و دل کے چراغ روشن کر کے اپنی تنہائی سے باتیں کرنے لگتا ہے۔

دِن تو اے دوست کسی طور گزر جاتا ہے
شام آتی ہے تو دِل درد سے بھر جاتا ہے

ہم سے مقامِ دل پہ اگر مل سکے تو مل
دولت کے دائروں میں کریں تجھ سے بات کیا

ایسے عالم میں کیا کرے کوئی
شام گزرے نہ جب سحر گذرے
کچھ ایسے گوشۂ خلوت میں اپنے مست ہوں میں
کہ بے نیازِ کشادو بست ہوں میں

سدرشن کنولؔ کی شاعری مبہم نہ سہی۔ لیکن انھوں نے فارسی لفظیات اور تراکیب کا استعمال کثرت کیا ہے۔ بعض پوری کی پوری غزلوں میں اضافتوں کی بھرمار ہے۔ لیکن اس کے باوجود شاعری میں بوجھل پن پیدا نہیں ہوتا۔

دشتِ جنوں کو پڑھنے کے بعد کچھ لوگوں کے چہرے اُترنے لازمی ہیں اور کچھ شعراء میں جرأت و حوصلہ بھی پیدا ہوگا کہ وہ اپنے مجموعے چھپوانے میں مزید تاخیر نہ کریں۔
سدرشن کنولؔ کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

جو بات زندگی کے نصابوں میں نہیں ہے
وہ میری نظر میں ہے کتابوں میں نہیں ہے

☆☆☆

وقارؔ صدیقی

''فردِ خیال'' کے آئینہ میں

محترم محمود الحق حقی صاحب کی وساطت سے وقار صدیقی صاحب کا شعری مجموعہ ''فردِ خیال'' میرے کرم فرما استاد الاساتذہ جناب کوثر علی شاہدؔ جعفری صاحب نے اس شرط پر عنایت فرمایا کہ مطالعہ کے بعد اس پر ایک مضمون ضرور تحریر کروں۔

''فردِ خیال'' کے شاعر کا نام کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ شاید کہیں کسی ادبی پرچے میں پڑھا ہے۔ مجموعے کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے۔ چیدہ چیدہ اشعار پڑھے۔ کئی اچھے اور کئی شعر بہت اچھے لگے۔ دو تین روز میں پورا مجموعہ اوّل تا آخر پڑھ ڈالا۔ عموماً کسی شخصیت کے بارے میں لکھنا مشکل ہوتا ہے اور فن کے متعلق آسان۔ میرا تجربہ اور واقعہ اس کے برعکس ہے۔ مطالعہ کے بعد پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ کسی شخصیت کے بارے میں لکھنے سے زیادہ مشکل کام اُس کے فن کے بارے میں لکھنا ہے۔ بہر حال حکم کی تعمیل سے میرے لیے مفر نہیں ہے۔

وقار صدیقی کا شعری مجموعہ ''فردِ خیال'' غزلوں، نظموں، نثری نظموں اور ہائیکو پر مشتمل ہے۔ مطالعے کے بعد ایک بات جو بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ موصوف نے اپنے خیالات وجذبات کی ترسیل کے لیے ترقی پسند اسلوب اختیار کیا ہے اور اُن کے

نزدیک روٹی، کپڑا اور گھر ہی سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ پورا مجموعہ ہی ترقی پسندر جحان کا حامل ہے۔ شاید اسی لیے زندگی اُن کے ہاں اپنی بوقلمونی کے ساتھ جلوہ گر نظر نہیں آتی۔ احتجاج کی جو پُر خطر راہ انھوں نے اپنی عملی زندگی میں اختیار کی ہے وہ اُن کی شاعری میں بھی جلوہ افروز ہے لیکن شاعری میں احتجاج کی لے بڑی دھیمی ہے۔

وقار صدیقی کا ماننا ہے کہ انسان کی نجات مارکسی نظریات کو اپنانے اور عوامی جدو جہد میں شمولیت اختیار کرنے ہی میں ہے یہ شاید اُن کے لیے اِس لیے بھی ضروری ہے کہ اُن کا تعلق محنت کشوں اور ملازموں کے حقوق کے لیے لڑنے والی تحریکوں سے رہا ہے۔

ادب میں ترقی پسندانہ روش اختیار کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ لیکن اکثر ہوتا یہ ہے کہ جب ترقی پسندوں کے ہاں احتجاج کی لے حد سے تجاور کر جاتی ہے تو وہ محض نعرہ بن جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ترقی پسند نظریات کے حامل شاعروں اور ادیبوں کے ہاں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ یکسانیت موضوعات، لفظیات، اصطلاحات اور کافی حد تک طرزِ بیان میں بھی پائی جاتی ہے۔

شاعری تب تک شاعری رہتی ہے جب تک اُس میں رمز و کنایہ اور اشاریت موجود ہو۔ رمز و کنایہ سے عاری، سپاٹ شاعری کوئی نعرہ یا تقریر کا حصّہ تو ہوسکتی ہے، اچھی شاعری ہرگز نہیں۔

وقار صدیقی صاحب نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ ان عیوب سے اپنی شاعری کو پاک رکھا جائے۔ اُن کی شاعری کسی فیشن یا فارمولے کی پابند نہیں ہے اور نہ ہی انہوں نے خود کو بھیڑ کا حصّہ بنایا ہے۔ اُن کی شاعری بڑے سچّے اور عوام دوست جذبات کی شاعری ہے۔ عوام کی خیر خواہی ہی اُن کا مقصدِ حیات ہے۔ شاعری اُن کے لیے تفننِ طبع یا نام کمانے کا ذریعہ نہیں ہے۔ وہ عوام کے نمائندہ ہیں اور عوام ہی کے لیے شاعری کرنا چاہتے ہیں۔

شاعری میں عشق و جمالیات کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ دنیا کی تمام تر رونقیں اور رنگینیاں حسن و عشق کے درمیان فطری کشش ہی کا نتیجہ ہیں۔ بات

چاہے حق وصداقت ہی کی کیوں نہ ہو بادہ وساغر کا ذکر کیے بغیر بنتی نہیں ہے۔
اسی لیے غالب کو کہنا پڑا تھا۔

ہر چند ہو مشاہدہ، حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

وقاؔر صاحب کو اس حقیقت کا نہ صرف یہ کہ احساس ہے بلکہ انھوں نے اس کا اعتراف بھی اپنے اس شعر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔

یادِ جاناں بھی غمِ دوراں میں لازم ہے وقاؔر
ایک مدّت ہوگئی ہے اشک برسائے ہوئے

وقار صاحب نے سچ اور جھوٹ، بھوک اور لوٹ کے درمیان صدیوں سے جو جنگ جاری ہے کو اپنے اکثر اشعار کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس نے ہر دور میں حسّاس ذہنوں کو جھنجھوڑا ہے اور صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے اُکسایا ہے۔

عجب مسئلہ ہے کہ تمام تر انسانی کوششوں کے باوجود کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس جنگ کا ختم ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ وقار صدیقی صاحب نے زندگی کی بعض دردناکیوں اور کربناکیوں کو بڑی شدّت سے محسوس بھی کیا ہے اور مصلحت اندیشیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے پوری ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ بہت بے باکانہ اور آزادانہ اظہار اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ انہوں نے ضمیر کا سودا نہیں کیا بلکہ سرفروشی کی تمنا کو بیدار کیا ہے۔

اُن کا مجموعہ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی سرفروش ہر قسم کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہاتھوں میں پرچم لیے پورے جوش وولولے کے ساتھ کسی قافلے کی قیادت کر رہا ہو۔

لہو میں ڈوبے ہوئے احتجاج کرتے ہوئے
سڑک سڑک سے گزرنا بہت ضروری ہے

کیا سوچ رہے ہو تم بیٹھے ہوئے ایسے میں
آؤ چلو زنداں کی دیوار گرانی ہے

وقارؔ صاحب کی غزلوں کے بعض اشعار دل کو چھونے والے ہیں۔

آگے بڑھئے ضرور آپ مگر
دوسروں کو گرا کے مت بڑھئے

اس میں بھی شاید اُس کی کوئی مصلحت ہی ہو
وہ جانتا تو ہے مجھے، پہچانتا نہیں

وہ فیصلہ جو میں نے بہت سوچ کر لیا
اس فیصلے کو دل مرا کیوں مانتا نہیں

کوئی بات ہے اُس آدمی میں
بُرا ہو کر بھی جو اچھا لگے ہے

لگا کے آگ نشیمن کو دیکھنے والو
سکونِ دل نہ تمہارا حرام ہو جائے

اپنی ہی سرزمیں میں مہاجر ہوئے جو لوگ
دستِ ستم کا ڈر انھیں اکثر دِکھائی دے

الزامِ بے وفائی دیا جائے گا مگر
تفریقِ خار و گل کو مٹایا نہ جائے گا

سرنگوں کلیاں ، گل افسردہ شگوفے مضمحل
اِک زمانہ ہوگیا ، فصلِ بہار آئے ہوئے

وقارؔ صاحب کی شخصیت کا بھرپور اظہار اُن کی نظموں اور بالخصوص نثری نظموں میں ہوا ہے۔اُن کی نثری نظم ''اِس لئے'' حاصلِ مجموعہ ہے۔

تم مجھے
خودساختہ
قانونوں کے قیدخانوں میں
اس لئے قید کرتے چلے جارہے ہو
تاکہ
تم اور آزاد ہوسکو۔

نظم ''مشورہ'' کا بند ملاحظہ ہو۔

آ بنائیں اِک رستہ
جس کے ہر کنارے پر
پیار کے درختوں کی
خوشنما قطاریں ہوں

نظموں کے علاوہ ہائیکو کے لیے بھی اُن کی طبیعت بہت موزوں ہے۔اُن کی عوام دوستی اور روشن خیالی سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ادب کے ذریعے عوام کی آواز دنیا تک پہنچاتے رہیں گے۔

☆☆☆

پنجاب میں وطن پرستی کا رجحان:
حالیؔ اور اقبالؔ کے حوالے سے

غیر منقسم پنجاب میں وطن پرستی کے رجحان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پیدا ہوئے اُن تمام حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے جو یہاں کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی زندگی پر اثر انداز ہوئے اور جنھوں نے نہ صرف پنجاب بلکہ تمام ساکنانِ وطن کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ادیبوں اور شاعروں کو بدلتے ہوئے حالات کے عصری تقاضوں پر قلم اٹھانے کے لیے مجبور کیا۔ نوجوانوں کو فکری و عملی طور پر متحدہ و متحرک کیا۔ سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کو قومی یک جہتی اور ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے اُبھارا۔

۱۸۵۷ء کا غدر ہندوستان کی تاریخ میں بالخصوص اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ دور تھا جب مغلیہ حکومت کا سورج غروب ہو رہا تھا اور ریاستی حکومتیں اپنی اندرونی سازشوں کی وجہ سے کمزور پڑ چکی تھیں اور ملک بھر میں انتشار پھیل چکا تھا۔ ہر طرف بدامنی، بدنظمی، مذہبی منافرت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ ہندوستانی اقوام انگریزوں کی ناپاک حرکتوں اور گھناؤنی چالوں کا شکار ہو چکی تھیں۔

دراصل انگریز ہندوستان پر اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتے تھے۔ اپنے اسی مقصد کو

حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی پالیسی اپنائی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے انھوں نے مذہب کو حربے کے طور پر استعمال کیا اور وہ کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ انگریزوں کے ذریعے پھیلائے گئے مذہبی تعصب اور نفاق کا فوری اور لازمی اثر یہ ہوا کہ مختلف تہذیبوں، عقیدوں اور مذہبوں کے ماننے والے لوگ، جو صدیوں سے آپس میں مل جل کر رہتے تھے، جو ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے تھے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں اور تہواروں میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ پیروں، فقیروں، سادھو، سنتوں کی تعلیمات پر عمل کرنے والے انسان دوستی اور بھائی چارے کا پیغام دینے والے، گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دینے والے، امنِ انسانیت کے علم بردار انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہو کر مذہبی تعصب کی بنیاد پر ہندو مسلم کے خانوں میں بٹ گئے۔ جس کا فائدہ انگریزوں کو پہلی جنگِ آزادی یعنی غدر کی کامیابی کی صورت میں ہوا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے سبھی فرقوں کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرو کر از سرِ نو جنگِ آزادی کے لیے متحد کر کے لڑنے کے لیے تیار کرنے کی سخت ضرورت تھی تا کہ قومی شعور کو بیدار کر کے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرایا جا سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اردو شعراء اور ادباء نے جو سیکولر کردار ادا کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوستانی عوام میں یک جہتی پیدا کرنے، قومی شعور بیدار کرنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی اہمیت پر جن شعراء نے زور دیا اُن میں حالی کا نام سرِ فہرست ہے۔ حالؔی ہی پہلے شاعر تھے جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے قومی یکجہتی کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ حالؔی نے اپنی شاعری کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد و یگانگت پر زور دے کر مساوات اور قومی یک جہتی کے جذبات کو ابھارا اور باہمی اختلافات و تفرقات کو ملک کی آزادی اور فلاح و بہبود کے لیے ختم کرنے کا صحت مند پیغام دیا۔ حالؔی کو ایمان کی حد تک یقین تھا کہ جب تک اہلِ ہند مذہبی تعصب، نفرت اور عداوت کو چھوڑ کر پیار، محبت، مذہبی

رواداری اور خلوص کو نہیں اپنائیں گے ملک غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

حالؔی کی شاعری میں حب الوطنی اور قومی یک جہتی کا یہ سلجھا ہوا شعور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی حالات میں ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوا اور اِن کی شاعری میں وطن پرستی کے خدوخال اپنے نئے ابعاد میں اُبھرنے لگے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین۔

''حالؔی نے پہلی بار ''قوم'' لفظ کو اہلِ ملک کے معنی میں استعمال کیا۔''

اور اس طرح حالؔی نے پہلی بار ہندوستانی قوم کا تصور پیش کیا ہے۔ حالؔی کے ہاں وطن پرستی کا اظہار وطن کی مدح سرائی میں بھی ہوا ہے۔

بقول وزیر آغا:

''حالؔی اپنی قومی اور نیچرل شاعری سے قوم کو قعرِ مذلت سے باہر

نکالنے کا ایک عظیم کارنامہ سرانجام دینے کے متمنی تھے“

حالؔی کی شاعری میں قوم اور اجتماعیت کا جو تصور ملتا ہے وہ حالؔی سے پہلے کے اردو ادب میں لگ بھگ مفقود تھا اور کم و بیش ہر شاعر و ادیب اپنے انفرادی جذبات کے اظہار سے مطمئن تھا۔

جاں نثار اخترؔ کے لفظوں میں:

”اردو شاعری کے ابتدائی دور کی شاعری میں قومیت یا حبِ وطن کا وہ تصور تو نہیں لا سکے جو یورپ کی دین ہے اور جو اٹھارویں صدی کی پیداوار ہے۔“

جب اردو نشو نما پا رہی تھی اس وقت اس پر عربی فارسی کی گہری چھاپ تھی اور یہ رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب و تمدن سے مانوس ہو رہی تھی۔ ہندوستانیت کی روح اور یہاں کی مٹی کی بو باس کو اپنے اندر سمونے میں لگی ہوئی تھی۔

بقول عبادتؔ بریلوی:

”جس زمانے میں اردو ادب کا آغاز ہوا ہے، اس نے اپنے سفرِ ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں۔ اس وقت سارے ہندوستان میں قومیت اور وطنیت کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں تھا۔ زندگی کی نوعیت انفرادی تھی۔ جاگیردارانہ دور نے افراد کے فکر و خیال پر ایسے پہرے بٹھا دیے تھے کہ انھیں قومیت اور وطنیت کے اجتماعی تصور کا خیال نہیں آتا تھا۔ زندگی میں کوئی سماجی یا اجتماعی تحریک نہیں تھی، کسی قسم کا معاشی یا اقتصادی نصب العین نہیں تھا۔ کسی طرح کا ملکی یا ملیؔ لائحہ عمل نہیں تھا۔ شہنشاہیت اور شخصی حکومت نے صدیوں سے اس طرح سوچنے اور غور کرنے کی اجازت ہی نہیں دی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اردو ادب میں اجتماعی شعور ایک زمانے میں نام کو بھی پیدا نہیں ہوا اور

اس کا یہ اثر ہے کہ عرصے تک اس میں حبِ وطن کے اجتماعی تصورات
کی روایت قائم نہ ہو سکی۔''

حالی کو اس بات کا گہرا شعور تھا کہ جب تک لوگوں میں حب الوطنی کے جذبات کو اُبھارا نہیں جائے گا ان میں اتحاد و اتفاق پیدا نہیں ہوگا۔ ایک طرف جہاں ہندوستانی عوام غفلت کی نیند سو رہے تھے وہیں دوسری طرف اردو کے بیشتر شعراء ایسے تھے جو ادبی حلقہ بندیوں میں اسیر تھے اور دلی اور لکھنو ہی کی محبت میں گرفتار تھے یا زیادہ سے زیادہ آس پاس کے کچھ علاقوں ہی سے اُن کو محبت تھی۔ سارے جہاں کے درد سے انھیں کوئی سروکار بھی نہیں تھا۔ وہ شہر آشوب کی شکل میں دل اور دلی کا مرثیہ اور معاشرے کے زوال پر ماتم تو کر سکتے تھے لیکن جذبہء حب الوطنی کے فقدان کے سبب اُن کا قلم وطن پرستی اور قومی اتحاد کے گیت نہیں لکھ سکتا تھا۔

پروفیسر آزاد گلاٹی کے الفاظ میں:

''اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا اظہار انھیں علاقوں اور سرزمینوں کی تہذیب و معاشرت سے انس و محبت کی شکل میں ابھرا ہے، چونکہ اس عہد کے افراد میں معاشرے کو بہتر بنانے کی سکت نہیں تھی وہ اس معاشرے کے زوال کا مرثیہ ہی لکھ سکتے تھے۔ اس کی مثال میر کی غزلوں اور سودا کے شہرِ آشوب میں ملتی ہے۔''

میر و سودا کے عہد کا ہندوستان غالب تک آتے آتے کئی کروٹیں لے چکا تھا۔ ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی فضا بدل چکی تھی۔ خارجی حالات اور ذہنی کیفیات کی بدولت لوگوں میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نے لے لی تھی۔ حُب الوطنی کا نظریہ جو میر و سودا کے زمانے میں اپنے محدود معنوں ہی میں استعمال ہوتا تھا۔ اب وہ وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا تھا۔ اس عہد کے شعراء میں اپنے عہد کا مرثیہ لکھنے کے بجائے قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔

بقول وزیر آغا:

''حب الوطنی کی ایک فعال تحریک کے تحت شاعری کو وطن کی دھرتی اور اس کے مظاہرے سے قریب تر کرنے کی ایک رو وجود میں آ گئی تھی''۶

یہی وہ دور تھا جس میں وطن پرستی اور اجتماعیت کا جذبہ پہلی بار نکھر سنور کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

حالؔی کی ابتدائی شاعری کسی واضح سیاسی مقصد کی نشان دہی تو نہیں کرتی ہے لیکن پہلی جنگِ آزادی کے بعد افکار و خیالات اور نظریہ میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں اُن کا نمایاں فرق ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کی شاعری میں ضرور دیکھنے کو ملتا ہے۔ شاعری کے لیے اُن کا نقطہ ءنظر بدل چکا تھا اور ان کی شاعری میں اصلاحی اور اخلاقی رنگ غالب آ چکا تھا، یہی اخلاقی اور اصلاحی رویّہ ان کی وطن پرستی کی اساس بنا۔ حالؔی کے ہم عصر محمد حسین آزادؔ نے بھی حب الوطنی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ حالؔی اور آزادؔ کے نظریہ ءحب الوطنی کے فرق کو واضح کرتے ہوئے علی جواد زیدی رقم طراز ہیں۔

''حالؔی کے حبِ وطن کا تصور محدود ہے۔ وہ وطن سے صرف ایک جغرافیائی علاقہ رکھتے ہیں۔ لیکن آزادؔ نے حب وطن کی بڑی جاندار تشریح کی ہے۔ اس میں وطن کو ترقی دینے کے لیے سعی کرنے اور وقت پڑنے پر جان تک دینے سے گریز نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔''

اب میں تمہیں بتاؤں کہ حبِ وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور ہوائے چمن ہے کیا

حبِ وطن ہے جلوہ اسی نورِ پاک کا
روشن اسی کے نور سے عالم ہے خاک کا

ہو مہر میں یہ نور تو اس کو کرن کہیں
گر دِل میں جلوہ گر ہو تو حبِ وطن کہیں

بیسویں صدی کے آغاز میں بدلتے ہوئے سماجی اور سیاسی منظر نامے کے پیشِ نظر حالی کے سماجی اور اصلاحی شعور وطن پرستی میں سیاسی شعور بھی پیدا ہونے لگا تھا۔ اب ان کی شاعری میں ملک وقوم کے شاندار ماضی کو یاد کر کے عہدِ رفتہ کی دل آویزی وحسن آفرینی پر ماتم کرنے کا رجحان ختم ہو چکا تھا اور ملک کی تعمیر وتشکیل، سیاسی آزادی اور جدو جہد کا جذبہ ابھر آیا تھا۔

بقول عبادت بریلوی:

> وطن پرستی کی نوعیت اب سیاسی ہو جاتی ہے۔ جس میں انگریزوں کی مخالفت کا خیال بڑھ جاتا ہے۔ سیاسی آزادی کا تصور پھیلتا ہے۔ ملکی تعمیر کے منصوبے باندھے جاتے ہیں، جدو جہد کا جذبہ اور عمل کی خواہش عام ہو جاتی ہے۔ اس طرح حب الوطنی کی روایت میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ اب وہ اصلاحی اور اخلاقی سے زیادہ سیاسی اور قومی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔''

حالی کے بعد پنجاب میں وطن پرستی کا رجحان اقبال کی ابتدائی شاعری میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ حالی نے حب الوطنی کے جو چراغ روشن کئے تھے ان کی لَے کو اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے تیز تر کیا۔ اقبال کے پہلے دور کی شاعری قومی شاعری کی بہترین مثال پیش کرتی ہے، جس میں انھوں نے ملک وقوم سے اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کیا

ہے۔اُن کے ابتدائی دور کی زیادہ تر نظمیں ''ترانہ ہندی''، ''نیا شوالہ'' اور ''ہمالہ'' وغیرہ قومی یک جہتی، مذہبی رواداری اور خیر سگالی کا آئینہ ہیں۔وہ فرقہ پرستی کے شجر کو کاٹنے اور اس کے برے اثرات سے محفوظ رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے جو جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبالؔ نے تمام مذاہب کی بنیادی تعلیمات کے حوالے سے کہا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اقبالؔ کو علم تھا کہ قومی یکجہتی کا جو شیرازہ انگریزوں نے اپنی شرانگیزیوں سے بکھیر دیا ہے اُسے یکجا کرنا اگرچہ آسان نہیں لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں اِن بکھرنے دانوں کا
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

اقبالؔ کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ غلامی سے نجات کا واحد ذریعہ قوموں کی

بیداری اور ترقی کا راز اتحاد و اتفاق میں مضمر ہے:

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

اقبالؔ ایک سچے محبِ وطن ہونے کے ساتھ ساتھ تمام مذاہب کا دل سے احترام کرتے تھے۔ حالیؔ اگر بہشت کے بدلے وطن کی مشت بھر خاک کو مقدم سمجھتے ہیں تو وہیں اقبالؔ کے لیے وطن کی خاک کا ہر ذرہ دیوتا ہے اور رام، گورونانک جیسی شخصیات ان کے لیے قابلِ احترام ہیں۔ ''ہندوستانی بچوں کا گیت'' میں وطن کی عظمت کا بیان بڑی عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔

چشتی نے جس زمیں پر پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا

وحدت کی لے سُنی تھی دُنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

''ترانہء ہندی'' میں اقبالؔ کی وطن پرستی کا جذبہ شدت پسندی کی انتہا پر نظر آتا ہے۔ جس میں وہ وطن کے اس قدر پرستار نظر آتے ہیں کہ انھیں اپنا وطن تمام خامیوں کے باوجود ساری دنیا سے اچھا نظر آتا ہے۔ اس نظم کے حوالے سے اقبالؔ نے نہ صرف یہ کہ اپنے وطن کی عظمت بیان کی ہے بلکہ اہلِ وطن کو اتحاد کا پیغام بھی دیا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

''نیا شوالہ'' میں وہ تمام عالمِ انسانیت کو اتحاد و محبت سے مل جل کر رہنے کا پیغام دیتے ہیں۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

انگریزوں کی ناپاک چالوں سے ہندوستان میں مذہب کا جو غلط تصور قائم ہو گیا تھا۔ جس سے ہندوستانی عوام کے درمیان نفاق اور نفرت پیدا ہو چلی تھی۔ اقبالؔ نے اس فاسخ تصور کو رد کیا اور تمام ہم وطنوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیا۔ ''تصویرِ درد'' میں اقبال کی وطن پرستی کا جذبہ اہلِ ہند پر ہو رہے انگریزوں کے ظلم و ستم کی مخالف کی صورت میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو انگریزوں کی چال بازیوں سے محتاط رہنے اور مستقبل میں پیدا ہونے والے خطرات سے آگاہ رہنے کی تعلیم دی ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

سیّد مظفر حسین برنی کے لفظوں میں:

''اقبالؔ چاہتے ہیں کہ اہلِ وطن اپنی عظمتوں کے شناسا ہوں، فکر میں بلندی پیدا کریں، ذہنی پستی کے قعر سے نکلیں اور اعلیٰ انسانی اقدار کے بامِ عروج تک پہنچیں۔''

اور بقول آزاد گلاٹی:

''اقبالؔ کے ہاں وطن پرستی کا تصور اس قدر ہمہ گیر ہے کہ اس میں سماجی، ثقافتی، اصلاحی، معاشی، سیاسی بھی پہلو یکجا ہو گئے ہیں۔''

حالیؔ اور اقبالؔ کے علاوہ پنجاب کے شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن کے ہاں وطن پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ جن میں ظفرؔ علی خاں، حفیظؔ جالندھری، تلوک چند محرومؔ، فیض احمد فیضؔ، ساحرؔ لدھیانوی، جوشؔ ملسیانی، پنڈت میلا رام وفاؔ، اودے سنگھ شاقؔ،

پورن سنگھ ہنرؔ، نوبہار صابرؔ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ اور جگن ناتھ آزادؔ وغیرہ کے نام اس ضمن مین قابلِ ذکر ہیں۔ مضمون کی طوالت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یہاں ان کا ذکر تفصیل سے کیا جائے۔

☆☆☆

اردو زبان کا المیہ

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا تو ہمارے ملک کے سامنے سماجی، سیاسی ،اقتصادی اور تعلیمی مسائل پیدا ہوئے۔ اِن سب سے بڑا مسئلہ زبان کا مسئلہ تھا یعنی یہ کہ ہندی کو قومی زبان کے طور پر اپنایا جائے یا اردو کو۔ یہ مسئلہ اس لیے پیدا ہوا کہ دونوں زبانوں کے بولنے والے لوگوں کی بڑی تعداد اس ملک میں موجود تھی۔ اردو زبان ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت رہی ہے۔ اس کی پرورش و پرداخت میں نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں نے حصہ ڈالا بلکہ ملک کے تمام مذاہب کے لوگوں نے حتیٰ کہ انگریزوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں اسے فروغ دیا۔ تقسیم ہند سے قبل اردو ہی پورے ملک کے رابطے کی زبان تھی۔ نہرو اور گاندھی جی نے اردو کو ''ہندوستانی'' کہہ کر دو رسم الخط میں رواج دینے کی کوشش کی مگر چند فرقہ پرستوں نے زبان کے مسئلہ کو اس قدر طول دیا کہ پورے ملک میں ہندی اردو کا تنازع کھڑا ہو گیا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلا گیا اور صرف ایک ووٹ کے فرق سے اردو ہمارے ملک کی قومی زبان بنتے بنتے رہ گئی۔

۱۹۵۶ء جب ملک میں ریاستوں کی تشکیلِ نو ہوئی اور زبان کی بنیاد پر ریاستوں کی تنظیم ہوئی تو اردو پھر ایک بار ''بے گھری'' کا شکار ہوئی اور کشمیر کو چھوڑ کر کسی بھی ریاست کی سرکاری زبان نہیں بن سکی اگرچہ اس کے بولنے والے پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

کون صاحب عقل ایسا ہے جو زبان کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے۔ زبان ہی ہے

جس کے ذریعے ہم اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی بات کو آسانی سے اور صحیح طور پر دوسرے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ آج بھی ہندوستان کے زیادہ تر لوگ اردو زبان ہی استعمال کر رہے ہیں۔ ہندی بولنے والے بھی غیر شعوری طور پر اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ اردو، ہندی کا قریبی رشتہ اور قواعد کا یکساں ہونا ہے۔ مثلاً اسم، اسمِ ضمیر، صفت، افعال اور گرامیٹیکل اسٹرکچر ایک جیسا ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف رسم الخط اور لفظیات کا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زبان کسی دوسری زبان کی نفی اور مخالفت نہیں کرتی۔ زبانیں ایک دوسری کو کمزور نہیں مضبوط بناتی ہیں۔ ہندی اور اردو تو دو جڑواں بہنیں ہیں۔

ہم ہندوستانی زبان کے معاملے میں نفسیاتی مریض ہیں۔ ہمیں اپنی زبان کے مقابلے میں انگریزی زبان زیادہ اچھی لگتی ہے۔ ہم اپنے بچوں کے منہ سے ''لب پہ آتی ہے'' اور ''جن گن من'' کے بجائے ''ٹونکل ٹونکل لِٹل سٹار'' سُننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہم اپنی زبان کے فروغ کا رونا بھی روتے ہیں اور اپنے ہی ہاتھوں اُسے قتل بھی کرتے رہتے ہیں۔ میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہوں گا کہ ہم میں سے کتنے والدین ایسے ہیں جو اپنے بچوں سے خود کو ابو جان اور امّی جان کہلوانا پسند کرتے ہیں؟ بلکہ ہم میں سے زیادہ تر یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے ہمیں ڈیڈی، ڈیڈ یا پاپا اور ممی یا موم کہہ کر ہی پکاریں۔ کیونکہ ہم ان لفظوں سے میڈیا کے ذریعے اس قدر مانوس اور مرعوب ہو چکے ہیں کہ ہم نے انھیں اپنے لیے ماڈرن کہلوانے کا Status Symbols تسلیم کر لیا ہے۔ میں نے کبھی کوئی آفیسر آدمی ایسا نہیں دیکھا جس نے یہ چاہا ہو کہ اس کے بچے کسی اردو میڈیم یا ہندی میڈیم سکول میں تعلیم حاصل کریں۔ ہر صاحب حیثیت یہی چاہتا ہے کہ اس کے بچے کسی کانوینٹ سکول یا انگریزی میڈیم سکول ہی میں تعلیم حاصل کریں۔ اُن کے ذہن میں یہ بات رہتی ہے کہ آج کا دور مقابلے کا دور ہے اگر اُن کے بچے انگلش میڈیم سکول میں نہیں پڑھیں گے تو وہ مقابلے کے اس دور میں دوسرے بچّوں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ آج

سرکاری اسکولوں میں غریب اور مزدور طبقہ کے بچے ہی داخلہ لیتے ہیں۔ ماڈرنائزیشن اور انگریزی کے نام پر ہماری نسلیں اپنی زبان وتہذیب سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہیں۔

یہ امر بھی مسلّم ہے کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنا ہو تو اُس ملک کی نوجوان نسل کو تباہ کردو اور نوجوان نسل کو تباہ کرنے کے لیے اُن سے اُن کا کلچر اور زبان چھین لینا ہی کافی ہے اور یہی کام آج کا ورلڈ میڈیا انجام دے رہا ہے۔ میڈیا ہمارے کلچر پر بُری طرح حاوی ہو چکا ہے۔ ہماری تہذیب وتمدّن کی جڑوں کو اندر ہی اندر کھوکھلہ کر رہا ہے اور ہم لوگ بصد شوق اپنے کلچر اور زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں اگر یہی حال رہا تو وہ دِن دور نہیں جب ہم اپنے ہی ملک میں اپنی پہچان کھو بیٹھیں گے۔

چین، جاپان اور جرمن کے بارے میں مشہور ہے کہ اِن ملکوں کے لوگ اپنی زبان کے لیے اپنی جان تک دے سکتے ہیں۔اس کے برعکس ہم ہندوستانی اپنی زبان میں بات کرنا اپنے لیے عار سمجھتے ہیں اور انگلش میں بات کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ جب تک ہم خود اپنی زبان کی قدر نہیں کریں گے تب تک دوسروں سے اپنی زبان کی ترقی کے لیے اُمید کرنا فضول ہے۔

اردو بولنے والے پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں،لیکن مردم شماری کے ذریعے سے صحیح اعداد وشمار ہمارے سامنے نہیں آتے۔ ہندوستان میں اردو کی حالت کچھ بھی ہومگر دنیا کے دیگر مما لک میں جہاں اردو بولنے پڑھنے اور لکھنے والے موجود ہیں۔ وہاں اس کی حالت کافی مستحکم ہے۔ پڑوسی ملک پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ دوبئ ،شارجہ،امریکہ اور برٹین وغیرہ میں اُردو بولنے والے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ وہاں کی سرکاریں نہ صرف یہ کہ اُن کے بچوں کے لیے اردو کی تعلیم کا خاص انتظام کر رہی ہے بلکہ انھوں نے اردو کو سرکاری دفتروں میں بھی لاگو کردیا ہے۔آج ہندوستان میں اردو کی جو حالت ہے اس کے لیے سیاست بھی ذمہ دار ہے۔ملکی تقسیم کے وقت مذہبی سیاست نے زبان کو بھی نہیں بخشا۔آزادی کے بعد جہاں سیاسی نقشوں میں تبدیلیاں ہوئیں وہیں اردو کو

بھی مُشرف بہ اسلام کر کے مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا اور اردو تعصب کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اردو کی زبوں حالی کے بارے میں زاہد الباری احسن کے مضمون کا یہ اقتباس بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا جو انھوں نے اردو اور مغربی بنگال کے حوالے سے لکھا ہے۔

سر سید احمد خاں جو ہندو مسلم اتحاد کے پُر زور حامی تھے اور ہندوستان کو ایک دلہن سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور کہتے تھے ہر ہندو اور مسلمان اس دلہن کی دو آنکھیں ہیں ان میں سے ایک آنکھ بھی خراب ہوگئی تو دلہن بھینگی اور بدنما ہو جائیگی۔ اسی جذبے کے تحت علی گڑھ کالج کا دروازہ انہوں نے ہمیشہ ہندوؤں کے لیے کھلا رکھا یہاں تک کہ علی گڑھ کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو ہی تھا۔ اردو سر سید کی جان ہی نہیں ان کی آن بھی تھی۔ مولانا حالؔی حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کچھ سر برآوردہ ہندوؤں نے جن کی زبان خود اردو تھی نے ایک تحریک چلائی کہ سرکاری عدالتوں میں اردو فارسی کو موقوف کر کے اس کی جگہ بھاشا یعنی دیوناگری کو رائج کیا جائے۔ حالؔی لکھتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے سر سیّد کو یہ کہتے سُنا تھا کہ بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور لوگوں کو ملانے کی کوشش کرنا محال ہے۔ چنانچہ اردو اور ہندی کے قضیہ نے طول پکڑا اور آزادی کے فوراً بعد ایک ووٹ کے فرق سے ہندی دیوناگری لیپی میں ملک کی قومی زبان بن گئی اور گاندھی جی کا ہندوستانی (فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں) کا فارمولا اور خواب چکنا چور ہوگیا۔ آہستہ آہستہ اردو کو مسلمانوں سے جوڑ دیا گیا اور عملاً اسے صرف مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا۔ ایک سازش کے تحت اردو کو پہلے دفتروں، پھر عدالتوں سے نکالا گیا، پھر اسکولوں کالجوں سے غرض کہ اردو کو ہر جگہ سے شہر بدر کر دیا گیا یہاں تک کہ اردو پر ملک کی تقسیم کرنے والی زبان کا الزام بھی گھڑ دیا گیا۔ یوپی اور پنجاب جو کہ اس کے گھوارے تھے وہاں سے اس کا صفایا کر دیا گیا۔ چنانچہ پچھلے ساٹھ سالوں کے اندر پنجاب جہاں ہر شخص کی زبان اردو تھی وہاں اس کا نام ونشان تک باقی نہ بچا۔ یوپی میں اردو میڈیم کے اسکول بند کر دیئے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج یوپی مسلم گھرانوں کی نئی نسل اردو۔ سے نابلد ہے بولتے

تو وہ فصیح اردو میں ہیں، لیکن لکھتے پڑھتے ہندی میں ہیں حتیٰ کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈینٹ یونین کے بعض ذمہ دار تک اپنی فصیح و بلیغ اردو کی تقریر کو ہندی میں لکھ کر پڑھتے ہیں۔

زبان صرف جذباتی نعروں اور حکومت سے شکوہ اور مطالبات کی بنیاد پر زندہ نہیں رہتی۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اس کا قاری ہونا لازمی ہے۔ بدقسمتی سے ہم مسلمان جو حقیقتاً اور عملاً آج اردو کے وارث ہیں (یہ کہتے ہوئے مجھے ذرا تامل نہیں) اردو کے نام پر نعرہ بازی تو کرتے ہیں۔ اس کے لیے ہم مخلص کوشش قطعی نہیں کرتے، آیئے ہم اپنا محاسبہ کریں کہ اردو کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہے، ہمارے عوام میں ایک تو اخبار پڑھنے کا شوق ہی نہیں ہے، کچھ لوگ اس کے شوقین ہیں بھی تو وہ اپنا شوق کسی ہوٹل یا چائے خانہ میں بیٹھ کر پورا کر لیتے ہیں۔ اخبار خریدنے کا تو رواج ہی نہیں ہے اپنی زبان کیلئے روزانہ ۲ روپیہ خرچ نہیں کر سکتے رونا وہی مفلسی کا، حالانکہ حقیقت اس سے پرے ہے، ہم میں سے اکثر دن بھر میں ۱۵۔۲۰ روپے چائے اور پان بیڑی پر خرچ کر دیتے ہیں۔ ہمارے سماج کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اردو کا اخبار پڑھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ احساسِ کمتری سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے اُن کا Status بگڑ جائے گا۔

حد درجہ تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ جو اردو والے اردو کی روٹی کھاتے ہیں وہ بھی اردو اخبار و رسائل خرید کر نہیں پڑھتے۔ اردو اخبارات و رسائل کی زبوں حالی کے لیے ہم اردو والے خود ذمہ دار ہیں۔ اشتہارات اخبار و رسائل کی ریڑھ کی ہڈّی ہوا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے تجارتی کمپنیاں انھیں اخبارات و رسائل کو اشتہار دیں گی جن کی سرکولیشن زیادہ ہوگی یعنی جن کے قاری زیادہ ہوتے ہیں اور جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے اور جسے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھتے ہوں۔

اردو کے قاری مسلسل گھٹتے ہی جا رہے ہیں۔ نتیجتاً اچھے قلمکار جن کی مادری زبان اردو ہے اور جنھوں نے اردو میں لکھنا شروع کیا تھا۔ آج ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں لکھنے پر مجبور ہیں۔ اُن میں سے اب تک تو بہتیروں نے ہندی کے لیکھک کی

حیثیت سے اپنی پہچان بھی بنالی ہے۔

اُن کی کوئی تحریر اردو میں چھپتی ہے تو ہزار دو ہزار کاپیوں کے فروخت ہونے میں کئی کئی سال لگ جاتے ہیں وہی اگر ہندی یا کسی دوسری زبان میں چھپتی ہے تو لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو جاتی ہے۔ پبلیشر کے لیے بھی اردو کی کتابیں چھاپنا اپنے لیے گھاٹے کا سودا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر یہی صورت حال رہی تو اردو بھی سنسکرت اور فارسی کی طرح ایک کلاسیکل زبان بن کر رہ جائیگی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج اردو اگر زندہ و پائندہ ہے تو دینی مدارس اور اردو میڈیم اسکولوں کی وجہ سے۔

یہ مدارس اور اسکول ہی اردو کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ آج مقابلہ کا دور ہے ہر شعبہ ءزندگی میں مقابلہ کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس پس منظر میں آج کے والدین جب اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں تو وہ اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھانا پسند کرتے ہیں۔

محض یہ کہہ کر کہ اردو میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد روزگار کے مواقع بہت کم ہیں، سراسر غلط ہے۔ اردو کو روزگار سے جوڑ کر دیکھنا ہی غلط ہے۔ اردو ہماری تہذیبی وثقافتی زبان ہے۔ اردو کو پیشہ وارانہ زبان کے طور پر نہیں تہذیبی وراثت کے طور پر اپنی نسلوں کو پڑھانا ہوگا ورنہ وہ دِن دور نہیں جب ہماری شناخت زبان کے لحاظ سے ختم ہو جائے گی اور زبان ختم تو ہمارا وجود زندہ لاش سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اردو کا دم بھرنے والے اس مظلوم و معتوب زبان کو اپنے سینے سے لگائیں، اپنے محدود وسائل کے باوجود اس کے بقا اور فروغ کے لیے ایک تحریک کی شکل میں ہر ممکن اقدام کریں اور گھر گھر میں اردو کی شمع روشن کریں۔

ہر رہ گذر پہ شمع جلانا ہے میرا کام
تیور ہیں کیا ہوا کے یہ میں دیکھتا نہیں

☆☆☆

پنجاب کی نئی اُردو غزل۔ عصری تناظر میں

ہر عہد کا ادب اپنے معاصر عہد میں نیا ہوتا ہے۔ جو کل نیا تھا وہ آج پرانا ہے اور جو آج نیا ہے وہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ پرانا ہو جائے گا، لیکن اردو ادب میں نئی غزل یا جدید غزل کا اطلاق ایک مخصوص عہد اور مخصوص رنگ کی غزل پر ہوتا ہے ہر چند کہ نئی اور جدید غزل کی شروعات حالیؔ کے عہد میں ہو چکی تھی۔ حالیؔ کے عہد کی اردو غزل موضوعات کے اعتبار سے نئی ضرور تھی لیکن لفظیات اور استعارات کے لحاظ سے اس میں زیادہ تبدیلیاں پیدا نہیں ہو سکیں۔

۱۹۶۰ء کے دہے میں سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں انہوں نے ملکی اور عالمی منظر نامے کو پوری طرح بدل ڈالا۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور معاشی معیار نے انسان سے اُس کی زندگی کا اعتبار چھین لیا۔ انسان کو اپنا وجود بے معنی نظر آنے لگا۔ مذہبی دعوے کھوکھلے نظر آنے لگے۔ اخلاقی اقدار قصہء پارینہ ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں جو غزل لکھی گئی وہ نہ صرف یہ کہ لفظیات و علامات کے لحاظ سے بالکل نئی تھی بلکہ مذہب سے بھی بیزار تھی۔ حالیؔ کا اصلاحی رنگ اور اقبالؔ کا قومی اور پیامی رنگ بھی اس عہد کی غزل میں نہیں تھا۔

نئی غزل کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

''نئی غزل کسی لازمے کا جبر قبول نہیں کرتی۔ وہ قطرے میں دجلہ کی تلاش کرتی ہے اور دریا میں فنا ہو کر عشرت کے حصول پر آمادہ

نہیں ہوتی۔ وہ عظمت کے بجائے حقیقت کا استعارہ بننا چاہتی ہے اور اپنے ذاتی تناظر کو کسی بھی تہذیبی، مذہبی، نظریاتی، فکری اور اخلاقی تناظر پر قربان کرنے سے دامن بچاتی ہے۔ نئی غزل کے اچھے نمونے (اور برے نمونے ہر عہد کی اور کسی بھی فکری یا فنی مسلک کی پابند شاعری میں عام ہیں۔) کلاسیکی غزل کی طرح نہ تو مروجہ اور مقبول تجربوں اور کوائف کے احاطے پر اکتفا کرتے ہیں نہ ترقی پسند غزل کی طرح بیرونی اور وسیع تر تہذیبی مقصد کے تابع ہیں، بلکہ مانوس، حقیقی اور بیک وقت بیدار اور خوابیدہ زندگی کے کارزار میں احساس کی سطح پر اپنے ذاتی اشتراک اور اُس کے نتائج کی روداد سنانے کے بجائے اُن نتائج کا تاثر پیش کرتے ہیں۔ چوں کہ حقیقتوں کو دیکھنے، برتنے اور پرکھنے کا زاویہ بدلا ہے اس لیے اظہار کی راہیں بھی تبدیل ہوئیں ہیں۔ نئی غزل میں الفاظ جامد حقیقتوں کے مظہر نہیں بنتے بلکہ جذبے کی حدت سے اُن حقائق کو سیال کر کے احساس کے سانچے میں ڈھالتے ہیں جن کے ذریعہ ہنگامی اور لمحاتی تجربے بھی وقت اور مقام کے وسیع تر کینوس پر پھیل جاتے ہیں۔ نئی غزل فکر اور فن کو زیادہ آزادی عطا کرتی ہے۔''

(غزل کا نیا منظر نامہ، از ڈاکٹر شمیم حنفی)

جھجک رہا تھا وہ کہنے سے کوئی بات ایسی
میں چپ کھڑا تھا کہ سب کچھ مری نظر میں تھا
(بانی)

کوئی منظر ہے نہ عکس اب کوئی خاکہ ہے نہ خواب
سامنا آج یہ کس لمحۂ خالی کا ہے

(باقیؔ)

بلندیوں پہ تھا محوِ سفر ہوا کی طرح
لباسِ خاک جو پہنا تو خاکسار ہوا

(کمار پاشی)

وہ دیوار کی ٹہنی پہ رک گیا سا چاند
ہوا چلے تو ابھی کروٹیں بدلنے لگے

(بمل کرشن اشکؔ)

'نئی غزل' روایتی غزل اور ترقی پسند غزل سے موضوعاتی، فکری علامتی اور لفظیاتی اعتبار سے مختلف ہے۔ روایتی غزل میں جذبۂ عشق کو مرکزیت حاصل تھی اور اس کا دائرہ کوچۂ محبوب تک ہی محدود تھا۔ جلوۂ جاناں اور محبوب کے ناز وادا غزل کی کل کائنات ہوا کرتی تھی۔ مے خانہ، محفل جاناں، چلمن رقیب، صحراو چمن، شمع و پروانہ، واعظ و ناصح، قاصد و نامہ بر، زاہد و پارسا، جام و صراحی، شراب و شباب، بہار و خزاں اور محبوب کے زلف و لب و رخسار با الفاظِ دیگر محبوب کا سراپا ہی روایتی غزل کے محبوب موضوعات ہوا کرتے تھے شاید یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے روایتی غزل کو فرسودہ اور بیمار شاعری قرار دیا۔ انہوں نے داخلی اور روایتی موضوعات کی جگہ خارجی اور عوامی مسائل و موضوعات کی اہمیت پر زور دیا، جہاں انہوں نے قاتل، مقتل، زنداں، سلاسل، تیغ، خنجر، پرچم، سلیب، دار و رسن، کھیت کھلیان، مفلس، مزدور، دہقان، افلاس، بھوک، جنگ، گرد، خون، کارواں، بھکاری ایسے الفاظ اردو غزل میں بھی کثرت سے استعمال کئے، وہیں صیاد، قفس، رقیب، گل و چمن، ہجر و صال، آشیانہ، شفق، شب، صبح، آندھی، پرندہ ایسے الفاظ کو ان کے طے شدہ دائرہ سے نکال کر نئے معنی و مفہوم عطا کیے۔ ترقی پسند اردو غزل کو حسن و عشق کی گلیوں سے نکال کر مقتل گاہوں میں لے آئے اور اس کے ہونٹوں کو شرابِ ہوش رُبا کے بجائے مے تلخئی حالات کا ذائقہ عطا کیا۔ ترقی پسندوں نے ہنگامی اور وقتی موضوعات کو ہی اپنی غزل کا اہم موضوع

بنایا۔ ترقی پسند غزل کا سفر خارجیت کی طرف رہا جبکہ نئی غزل ترقی پسند غزل کے برعکس خارجیت سے داخلیت کی طرف سفر کرتی ہے۔ نئی غزل کے اندر بے چارگی ،شکستِ ذات، مایوسی اور نا امیدی کی جو فضا ملتی ہے اسی وجہ سے ترقی پسندوں نے اسے بیمار ذہن اور نفسیاتی مرض سے تعبیر کیا ،لیکن بقول ڈاکٹر شمیم حنفی۔

> ''نئی غزل علامتی غزل ہے اور اس کی زبان روزمرہ کی زبان نہ ہوکر تخلیقی زبان ہے جس کی اپنی ایک مخصوص فضا ہے ۔نئی غزل جن مخصوص حالات اور ماحول کی پروردہ ہے اسی کے حوالے سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔''

۱۹۹۰ء کے بعد نئی غزل کا جو منظر نامہ اُبھر کر سامنے آیا ہے وہ اُس نئی غزل سے بالکل مختلف ہے جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس لکھی جارہی تھی۔ ادھر دس پندرہ برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اُسکی مثال ملنا مشکل ہے۔ آج ہم انسانی تاریخ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ دور سے گزر رہے ہیں۔ صنعت وحرفت کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے ہونے لگا ہے۔ صبح کے غم شام ہوتے ہی پرانے ہوجاتے ہیں ۔گلوبلائزیشن نے تمام دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کردیا ہے۔ تبدیلی جنس اور Sex determination عام ہونے لگا ہے۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں شادی سے پہلے جنسی تعلقات قائم کرنا اب کوئی معیوب بات نہیں رہ گئی۔ الیکٹرانک میڈیا، جنسی بے راہ روی کو فروغ دینے میں جو منفی کردار ادا کر رہا ہے یہ اُسی کا اثر ہے کہ بچے وقت سے پہلے بالغ ہونے لگے ہیں۔ High Breed کے اس دور میں ہر چیز ہائی بریڈ ہونے لگی ہے۔ موبائل اور انٹرنیٹ پر چیٹنگ کے ذریعے شادی کرنے کا چلن بھی عام ہونے لگا ہے۔ انسان اور جانوروں کے کلون تیار ہونے لگے ہیں۔ جانوروں کے اعضاء کو انسانی جسم کے اعضاء کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ہے۔ طاقت ور ممالک کمزور ممالک پر قبضہ جمانے کے لیے نیوکلیائی پاور کا غلط استعمال کرنے لگے ہیں

۔بارود کے ڈھیر پر بیٹھی یہ دنیا دن رات تخریبی کاروائیوں میں مصروف ہے۔آج دنیا کے طاقتور ممالک کے مابین نیوکلیائی جنگ کے ساتھ ساتھ ذہنی جنگ بھی چھڑ چکی ہے۔المختصر یہ کہ آج کا انسان خدا بننے کی کوشش میں مصروف ہے اور موت پر قابو پانا چاہتا ہے۔

ویسٹرن کلچر ہم پر بُری طرح حاوی ہو چکا ہے اور ہم زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کی نقالی کرنے میں فخر محسوس کرنے لگے ہیں۔رفتہ رفتہ ہمیں ہماری جڑوں سے کاٹا جا رہا ہے اور ہم خود بھی بصد شوق اپنی ہلاکت کے جشن میں ہمہ وقت اور ہمہ تن شریک ہیں لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمیں جس پر فریب اور پر خلوص طریقے سے ہلاک کیا جا رہا ہے ہمیں اُس کا احساس تک نہیں ہے۔ہو بھی کیسے؟ ہمارے ذہنوں تک کو مغرب نے ہائی جیک کیا ہوا ہے۔

ہم جس دور میں جی رہے ہیں وہ اربنائزیشن (Urbanization) کا دور ہے ۔جس میں انسان Self Centred زندگی گزار رہا ہے وہ اپنے ہم سائے کے ساتھ دکھ سکھ میں شریک ضرور ہوتا ہے لیکن محض دنیا داری کی حد تک۔اپنوں کی خوشی میں بھی اُسے خوشی محسوس نہیں ہوتی اور نہ اب اُس پر ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' والی بات صادق آتی ہے۔مشینوں کے ساتھ کام کرتے کرتے وہ خود بھی مشین ہی طرح بے حس ہو کر رہ گیا ہے۔ذہنی طور پر آج کا انسان تمام دنیا سے جڑا ہوا ہے۔لیکن جذباتی طور پر کٹا ہوا ہے ۔انسان جس قدر ترقی کر رہا ہے اتنا ہی غیر مہذب ہوتا جا رہا ہے۔اس تیز رفتار زندگی نے انسان سے اُس کا چین وسکون چھین لیا ہے۔وہ شام کو تھکا ہارا گھر ضرور جاتا ہے لیکن اُس کا ذہن دفتر کی فائلوں اور اپنے کاروبار کے سود وزیاں میں الجھا رہتا ہے۔اب اُسے گھر کے اندر بھی پہلے والا آرام وسکون میسر نہیں ہے۔اے۔سی (A.C) کمرے میں مخملی بستر پر سونے کی کوشش میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔نیند کے لیے اُسے خواب آور دواؤں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

آج کا انسان جن مسائل سے دوچار ہے اور وہ ذہنی سطح پر جس کرب سے گزر رہا

ہے پنجاب کے اردو غزل گو شاعروں نے اُن تمام مسائل وموضوعات کو اپنی غزل میں بخوبی پیش کیا ہے۔ پنجاب کے اردو شعراء کی غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار عصری مسائل وموضوعات کی عمدہ مثال پیش کرتے ہیں۔

کوئی دھڑکا لگا تھا یا خیال یار تھا ایسا
رہے ہم اپنی گہری نیند میں بھی جاگتے برسوں
(سردار پنچھی)

بکھر گیا ہے کوئی مثلِ بوئے گل رہبر
کوئی چراغ کی صورت جلا ہے کمرے میں
(راجندر ناتھ رہبر)

اگر حالات ہوں ناساز رشتے ٹوٹ جاتے ہیں
خزاں آتی ہے تو پیڑوں کے پتے ٹوٹ جاتے ہیں
(گوردیال سنگھ عارف)

جو دانا ڈھونڈنے نکلا تھا گھر سے
وہ پنچھی آج تک لوٹا نہیں ہے
(پروین کمار اشک)

خدا تو بہت دور آسمان پر تھا
زمیں پہ اپنا تجسّس وسیلہ ساز ہوا
(ڈاکٹر نریش)

مجھ سے پوچھو میں بنیاد کا پتھر ہوں
گھر کی چھت کا بوجھ اُٹھانا کیسا ہے
(خالد کفایت)

افسوس بہت ہے کہ یہ پورا نہیں اُترا
اُمید بہت رکھتی تھی دنیا نے بشر سے
(کرشن پرویزؔ)

ملال کیجئے کیا آفتاب ڈھلنے کا
یہی تو وقت ہے اپنے چراغ جلنے کا
(ڈاکٹر زینت اللہ جاویدؔ)

جہاں بھی چاہیں ڈبو دیں سفینہ ہم اپنا
یہ ناخداؤں نے دی ہیں سہولتیں کیسی
(شرون کمار ورماؔ)

ظلمت نے اس مقام پہ پہنچا دیا جہاں
آواز کے چراغ سے رستہ دکھائی دے
(تمناؔ لدھیانوی)

تیرے کرم کی مجھ کو شکایت ہے اس لئے
تیرا کرم فریب کرم ہے، کرم نہیں
(عاجزؔ جالندھری)

مقصد سفر کا بھول گئے اہلِ کارواں
معلوم بس یہی ہے کہ ہستی سفر میں ہے
(اشکؔ امرتسری)

اب تیرے غم کے پیغمبر بھی میرے ساتھ نہیں
اپنے غم خانے میں تنہا ہوں خدا کے مانند
(اسلم حبیب)

طرزِ فکر ایک سی ہے دونوں کی
راہزن ہو کہ وہ کوئی راہبر
(سدرشن کنولؔ)

میں نے تو اِک زمانہ ہوا لب ہی سی لیے
کب میری عرضِ شوق تیرے روبرو گئی
(محمود عالمؔ)

میں بھی پابندِ وفا رہ کے بھلا کیا کرتا
جب زمانے نے محبت کا چلن چھوڑ دیا
(ناشرؔ نقوی)

میں ڈوبتے میں سہارا تو اُس کا لے لیتا
وہ بات بات پہ احساں جتانے والا تھا
(انوار آذرؔ)

کیا ہوا ہر لب پہ اِک حرفِ دُعا ہے کس لیے
زندگی اس دور میں بے دست وپا ہے کس لیے
(مشتاقؔ وارثی)

صاف گوئی کا بھی کیا خوب نتیجہ نکلا
شہر کا شہر مرے خون کا پیاسا نکلا
(انجمؔ قادری)

جسموں کی نمائش ہے ، بازارِ محبت میں
اے نازؔ! کہاں کی یہ تہذیب و ترقی ہے
(نازؔ بھارتی)

ہر ایک شخص کے ہاتھوں میں چند پتھر ہیں
کوئی بھی سر ہو سلامت نکل نہیں سکتا
(عابدؔ سنامی)

عجب اک شان تھی اپنے گھروں کی
ڈرا کرتے تھے چھوٹے جب بڑوں سے
(ڈاکٹر محمد رفیع)

صد حیف کوئی اس کی گواہی نہیں دیتا
ہر چند کہ یہ قتل سرِ عام ہوا ہے
(محسنؔ عثمانی)

وہ گلوں کے ساتھ کانٹوں کو نہ کر پایا قبول
اس کے گلشن کی بہاروں کو خزاں ہونا ہی تھا
(پونم کوثرؔ)

ہم اس خیال سے رستہ بدل کے چلتے ہیں
وقار گھٹتا ہے ہر روز آنے جانے سے
(مہیشؔ پٹیالوی)

ہم نے جب خود سے کچھ نہیں چاہا
آپ سے کیا سوال کرنا ہے
(ظفر احمد ظفرؔ)

لوٹ آئے کھوٹے سکے کی طرح
گھر سے نکلے تھے کھرے بن کر بہت
(ریاضؔ خلجی)

اک وہ کہ اس کے آنے میں کچھ اور دیر ہے
اور پھول ہے کہ سوکھتا جائے ہے ڈال کا
(روبینہ شبنم)

صرف اک مجھ کو گرانے کے سبب
لوگ خود گرتے گئے معیار سے
(ششی بھوشن چراغ)

لوگوں نے آج مل کے اُسے قتل کردیا
اک شخص جی رہا تھا زمانے کے واسطے
(سلیم زبیری)

اہلِ نظر کو قوسِ قزح سے حسیں لگا
حالاں کہ اپنے پیار کا سادہ سا رنگ تھا
(سالک جمیل براڑ)

☆☆☆

Tanqidi Zā'viye

Critical & literary Articales

Written by:

Dr.Saleem Zuberi

ڈاکٹر سلیم زبیری شہر کی نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ادب سے ان کا تعلق ہمہ پہلو ہے۔ایک نوجوان شاعر کے طور پر ادبی محفلوں میں سلیم نے اپنا مقام پیدا کیا ہے۔۲۰۰۵ء میں ای۔ٹی۔وی کے اردو پروگراموں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے رہے ہیں اور متعدد ادبی ورکشاپس اور کورسز میں بطور ریسورس پرسن حصہ لے چکے ہیں۔ادبی خدمات کے لیے لالہ جگت نارائن ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔شہر کی ادبی تنظیموں سے ذمہ دار کی حیثیت میں وابستگی ہے۔

سلیم کا شعری مجموعہ 'شہرِ ندا' کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔شاعری کے بعد دوسرا ادبی میدان تنقید ہے۔ان کے متفرق تنقیدی مضامین اخبارات ورسائل کی زینت بنے ہیں۔ان مضامین کے لہجے میں نیا پن اور بیان میں شگفتگی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر طارق کفایت اللہ

(مجلّہ نثر نگارانِ مالیر کوٹلہ، شخصیت اور فن نمبر)

سلیم زبیری ایک سیدھا سادا معصوم شاعر ہے کہ جس کی زبان اور اس کے برتاؤ میں بھی مٹھاس اور چاشنی ہے۔وہ جہاں تعمیری ذہنیت کو فروغ دینے کی بات کرتا ہے تب بھی بشری کمزوریوں کو طنزیہ لب ولہجہ کے ساتھ لفظوں کی نشتریت کا سہارا لیتے ہوئے تلخ کلامی سے پیش نہیں آتا۔وہ عام انسانوں کے ساتھ عام انسانوں کی زبان میں گفتگو کرتا ہے اس لئے بھی کہ عجز و نیازی اور خاکساری اس کی فطرت کا حصہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

(مجلّہ جدید شعرائے مالیر کوٹلہ، شخصیت اور فن نمبر)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)

Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540

E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com

Website: www.ephbooks.com

978-81-8223-803-9